فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۰۹

ماہ جنوری ۱۹۷۲ء تا ماہ جون ۱۹۷۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماء	صفحہ	شمار	اسماء	صفحہ
۱	جناب الطاف حسین خانصاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۱۴۵	۸	ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین	۷۷، ۱۵۶، ۲۳۶، ۳۱۰، ۳۹۸، ۴۷۷
۲	جناب ڈاکٹر ایس، بی صمدی	۶۰	۹	جناب مولانا عبد الجبار صاحب استاذ مدرسہ مفتاح العلوم مئو	۴۲۴
۳	جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی	۵۳			
۴	جناب مولانا حبیب ریحان صاحب ندوی	۱۸۷	۱۰	جناب مولانا عبد الحلیم صاحب ندوی فاضل مصر استاد عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	۳۲۵ ۴۶۴
۵	جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مدرس مرکز علوم مدرسہ قرآنیہ شہر جون پور	۲۳۴	۱۱	جناب مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی	۱۵۱
۶	جناب مولوی سلمان شمسی صاحب ندوی	۲۲۳-۳۰۵ ۳۸۵-۴۶۲			
۷	سید صباح الدین عبد الرحمن	۴، ۷، ۲۴۵، ۳۲۲	۱۲	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی	۴۲

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۰۹)

ماہ جنوری ۱۹۷۲ء تا ماہ جون ۱۹۷۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۹ ۔ ماہ ذی القعدہ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۲ء ۔ عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ خواجہ غلام السیدین بھی دنیا سے رخصت ہوگئے، انکی موت علمی دنیا کا اندوہناک حادثہ ہے، وہ علی گڑھ کی بہترین پیداوار اور اس کا مثالی نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان میں علم و فضل، فکر و نظر، تقریر و تحریر، تالیف و تصنیف بہت سے کمالات جمع کر دیے تھے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انکو بڑی قدرت تھی تعلیم کے ماہر خصوصی تھے، انکے خیالات میں گہرائی کے ساتھ بڑا اعتدال و توازن تھا، اور وہ مغربی تعلیم اور مشرقی تہذیب کا سنگم تھے، وہ نئے دور کی پیداوار تھے، اور جدید علوم و افکار میں مہارت کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے، انکے دل میں اپنے مذہب و ملت کا درد تھا، اگرچہ بعض مسائل میں وہ جدید خیالات سے متاثر تھے لیکن اسلام کی ترجمانی کا پورا حق ادا کرتے تھے، انھوں نے قلم و زبان دونوں سے مذہب و ملت کی خدمت انجام دی، انکو ہندوستان اور اس کے باہر بڑے بڑے علمی اعزاز حاصل ہوئے، اور مختلف علمی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی موضوعوں پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیفی یادگاریں چھوڑیں، ان کی تصانیف بڑی فکر انگیز ہیں، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت اور دنیا کی طرح آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے، یوں تو آئے دن موتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب کوئی معاصر اور ہم عمر اٹھتا ہے تو اپنا وقت بھی قریب نظر آتا ہے، ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مذہبی حلقہ کے لیے مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی وفات بھی بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے صاحب تدین و تقویٰ عالم تھے، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز اور تبلیغی کاموں میں ان کے دست راست تھے، انھوں نے تبلیغ کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، ہر وقت اسی کی دھن رہتی تھی، انھوں نے بہت سے تبلیغی رسائل بھی لکھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، اس کے علاوہ مختلف قسم کی مشکلات میں مبتلا رہے، لیکن کوئی معذوری تبلیغی کام میں حائل نہ ہو سکی، اور مرض الموت تک اس کام کو انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے قوموں کے عروج و زوال، ترقی و تنزل اور کامرانی و ناکامی کے جو قوانین مقرر کر دیے ہیں وہ دنیا کی ساری قوموں کے لیے یکساں ہیں، کسی قوم و ملت کے لیے نہیں بدلتے۔ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا۔ اور خدا کسی قوم کی حالت میں اس وقت تک بگاڑ نہیں پیدا کرتا جب تک وہ خود اپنے میں بگاڑ نہ پیدا کرے، إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ۔ اس میں کوئی استثنی نہیں غزوۂ احد میں مسلمانوں نے غلطی کی، اسکا نتیجہ شکست کی صورت میں ظاہر ہوا، پاکستان کا انقلاب بھی اسی سنت الٰہی کا نتیجہ ہے، خدا نے پاکستانیوں کو جو نعمت دی تھی، وہ اس کے اہل نہ ثابت ہوئے، اسکی بقا و استحکام کیلیے جن تدبیروں کی ضرورت تھی اس سے غفلت برتی، انھوں نے جو گوناگوں غلطیاں کیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، اس پر پاکستان کی پچیس ۲۵ سالہ تاریخ شاہد ہے، اسکا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علحدگی کی صورت میں نکلا جس کا احساس اب خود پاکستانیوں کو بھی ہے،

مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان ڈیڑھ دو ہزار میل کا فاصلہ ہے، ان میں مذہب کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں، پاکستانیوں نے اپنے طرز عمل سے اس رشتہ کو بھی کمزور کر دیا، اس لیے ایک نہ ایک دن دونوں میں علحدگی یقینی تھی، افسوس اس کا ہے کہ یہ علحدگی خوشگواری کے بجائے انتہائی افسوسناک طریقہ سے ہوئی، فریقین کی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، دونوں حصوں پر تباہی آئی اور ان میں ایسی کدورت پیدا ہوگئی جو مدتوں میں دور ہوگی، اب مشرقی بنگال کی علحدگی ایک حقیقت بن چکی ہے، اس کو ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھایا جائیگا وہ مزید تباہی کا باعث ہوگا، اس لیے دونوں کو جوش و جذبۂ انتقام کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے، مشرقی بنگال میں خواہ کسی قسم کی حکومت قائم ہو بہرحال وہ

مسلمانوں کی اکثریت کا ملک رہے گا، اگر ایک طرف اس کے نکل جانے سے متحدہ پاکستان کو نقصان پہنچا تو دوسری طرف مسلمانوں کی ایک اور آزاد حکومت قائم ہوگئی، اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ گذشتہ واقعات کو فراموش کرکے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کیجائے، اس وقت دونوں کے جذبات مشتعل ہیں، اسلیے صحیح نقطۂ نظر سمجھ میں نہ آئے گا، لیکن ایک نہ ایک دن اس نتیجہ پر آنا پڑے گا، سیاست کی دنیا میں دوستی اور دشمنی ناپائیدار ہوتی ہے، آج کے دشمن کل دوست بنجاتے ہیں، انگریز بالکل اجنبی تھے، مشرقی بنگال والوں کو جتنی شکایتیں مغربی پاکستان سے تھیں اس سے زیادہ ہندوستان کو انگریزوں سے تھیں، مگر آزادی کے بعد دونوں کے تعلقات دوستانہ ہوگئے، اس کے مقابلہ میں مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان اتنے رشتے ہیں جو عارضی حالات سے ہمیشہ کے لیے نہیں ٹوٹ سکتے، اس لیے ان دونوں میں دوستانہ تعلقات کیوں نہیں ہو سکتے، یہی معاملہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہونا چاہیے، اسی میں سب کی بھلائی ہے،

مشرقی بنگال کی علیحدگی کے بعد بھی مغربی پاکستان انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کے بعد سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور ترقی یافتہ بھی ہے، اس میں ہر طرح کی صلاحیتیں ہیں، اس لیے وہ اب بھی اسلامی ملکوں میں نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ گذشتہ واقعات کو فراموش کرکے اپنی پوری توجہ اپنے نقصان کی تلافی اور ملک کی تعمیر و ترقی کی طرف منعطف کردے، اسکے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، برصغیر کی دونوں تقسیموں میں سب سے زیادہ مہاجر تباہ ہوئے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جن لوگوں نے مشرقی بنگال کو وطن بنایا تھا، اب اسکی سرزمین ان کیلیے تنگ ہو رہی ہے، اسکے اسباب جو بھی ہوں، مگر اب بہادری، شرافت اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ انکو بنگلہ دیش کا شہری تسلیم کیا جائے، جمہوری اور سیکولر حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی وہ بنگلہ دیش کے شہری ہیں اور یہ اسکی جمہوریت اور سیکولرزم کا پہلا امتحان ہے، اگر اس میں وہ ناکام رہا تو اسکی جمہوریت اور سیکولرزم پر بڑا بدنما دھبہ ہوگا، مسلمانوں پر سب سے زیادہ اثر مہاجرین کے ساتھ بدسلوکی کا پڑا ہے، جو حسن سلوک ہی سے دور ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسوقت کامیابی کے نشہ میں بنگلہ دیش والے اپنے کو مسلمانوں سے بے نیاز سمجھیں لیکن ہمیشہ کیلیے ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴)

فرنگی تہذیب فرنگی تہذیب کا ظاہر تو بڑا دلکش و دلفریب ہے لیکن باطن اعلیٰ انسانی اقدار سے بالکل خالی ہے، اس کا مقصد صرف مادی عیش و تنعم سے لطف اندوزی ہے، اس کو اقبال نے بڑے دلکش و مؤثر پیرایوں میں بیان کیا ہے، اس کی ظاہری دلفریبی بلکہ ساحری کو اس شاعرانہ انداز میں دکھایا ہے:

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ
جام او روشن تر از جامِ جم و اسکندر است

چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں را نگاہِ ساقیش پیغمبر است

لیکن اس کی باطنی حالت یہ ہے:

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل
عقل ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمیِ یک آہ بے تابانہ نیست
رند ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

وہ دانائے فرنگ کو پیام دیتے ہیں:

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری / عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

علم و حکمت اگرش خوئے سگے باز دہد / آدمی زادۂ دانا ز دد آں خوار تر است

(پیام مشرق)

اے باد صبا میری طرف سے دانائے فرنگ کو یہ پیام پہنچا دے کہ جب عقل نے بال و پر نکالے ہیں وہ اور بھی گرفتار ہو گئی ہے اس پر تعجب نہیں ہے کہ یورپ میں اعجاز مسیحائی ہے بلکہ تعجب اس پر ہے کہ اس کا بیمار اور بھی زیادہ بیمار ہے، اگر علم و حکمت انسان میں کتوں کی خصلت پیدا کر دے تو اس کا حاصل کرنے والا دانا آدمی زادہ حشرات الارض سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہو جائے گا،

نطشے کی زبانی فرنگی تہذیب کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیر مئیش / آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بہ ترازوئے دگر سنجیدیم / چشمہ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود

دعوی صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست / پیر ما گفت مس از سیم بیاید اندود

یہ فرنگ کا خرابات ہے، اس کی شراب کی تاثیر سے بری چیز بھی قابل ستائش نظر آتی ہے، ہم نیک و بد کو ایک دوسرے ترازو سے تولتے ہیں، کیونکہ نصاریٰ اور یہود کے ترازو کے پلے برابر نہیں تھے، صدق و صفا کا دعویٰ ریا کا پردہ ہے، ہمارے پیر کا کہنا ہے کہ گلٹ پر چاندی کا ملمع کرنا چاہیے

عصر حاضر کی مادیت سے دین فریادی ہے، اس کی نام نہاد آزادی میں ہزاروں بند پنہاں ہیں، اس نے اپنی غلط نقش آرائی سے انسانیت کے چہرے کا رنگ و روغن اور اس کی تر و تازگی ختم کر دی،

چہ عصر است ایں کہ دیں فریادی اوست / ہزاراں بند در آزادی اوست

ز روئے آدمیت رنگ و نم برد / غلط نقشے کہ از بہزادی اوست

اس کی نگاہ کافری کی مصور ہے، اور اس کی صناعی کا کمال آذری اور بت گری ہے،

نگاہش نقش بند کافریہا / کمال صنعت او آذریہا

ایک نظم میں اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور باطنی ظلمت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے،

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے / حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں / گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے / سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ حکومت / پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم / حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت / احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

کب ڈوبے گا یہ سرمایہ پرستی کا سفینہ / دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

مغربی تہذیب کے عناصر اس لطیف انداز میں بیان کیے ہیں:۔

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے / نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری

جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں / جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری

بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق / طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری

نظر دران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ / وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

فرنگی تہذیب قلب و نظر کا فساد اور روح کی پاکیزگی سے خالی ہے، اس لیے اس سے اعلیٰ انسانی صفات پیدا نہیں ہو سکتے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب / کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اس کا ظاہر دلکش و دلفریب ہے، لیکن باطن روشنی سے محروم ہے، اور اس کی ظاہری تابانی سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی،

نظر افرنگ کا اندازہ اسکی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے — فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب — بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پابرکاب

جس تہذیب کی بنیاد ایسے کمزور عناصر ہوں وہ محض تدبر کی فسوں سازی سے مستحکم نہیں ہو سکتی،

نظر کو خیرہ کرتی ہے مگر تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبر کی فسوں سازی سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

ایسی تہذیب جو خود مر رہی ہو دوسروں کو کیا زندہ کر سکتی ہے۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت جو ہے خود لبِ گور

اسی لیے وہ حیرت انگیز مادی ترقی کے باوجود انسانی فلاح سے قاصر رہی،

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اس تہذیب سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ یہ تہذیب بالکل بے جان ہو چکی ہے، فرنگی قوموں کا شعلہ اب بجھنے والا ہے، اس کی ظاہری آنکھ تو ضرور صاحب نظر ہے لیکن اس کا دل مردہ ہے، وہ خود اپنی تلوار کے زخم سے بسمل ہو رہی ہیں، وہ دوسروں کو کیا زندہ کر سکتی ہیں! ان کی شراب سے سوز و مستی پیدا نہیں ہو سکتی، ان کا آسمان نئی دنیا بنانے سے قاصر ہے، اب زندگی کا سوز و ساز تمہاری حرارت کا محتاج ہے، اور نئی دنیا پیدا کرنا تمہارا کام ہے،

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است — چشم شاں صاحب نظر دل مردہ است

زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش — بسمل افتادند از شمشیرِ خویش

سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں — عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شاں

زندگی را سوز و ساز از نارِ تست — عالمِ نو آفریدن کارِ تست

مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ تجدید کے نعرہ کے فریب میں نہ آؤ، اس کا مقصد فرنگی تہذیب کی تقلید ہے، اور تقلید کی غلامی سے خودداری جیسی بیش بہا چیز برباد نہ کرو،

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو — کر اسکی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک — ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ دائرۂ تجدید — مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

ایک نظم میں مصطفیٰ کمال کے تجدیدی کارنامے کی حقیقت بڑی خوبی سے ظاہر کی ہے،

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود — گفت نقشِ کہنہ را باید زدود

نو نہ گردد کعبہ را رختِ حیات — گر ز افرنگ آیدش لات و منات

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

سینۂ او را دمے دیگر نبود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود

لاجرم با عالمِ موجود ساخت — مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت

طرفگیہا در نہادِ کائنات — نیست از تقلید تقویمِ حیات

زندہ دل خلّاقِ اعصار و دہور — جانش از تقلید گردد بے حضور

یعنی مصطفےٰ کمال نے تجدید کا نعرہ بلند کیا، اور پرانی ترک قوم پر نیا صیقل کرنا چاہا لیکن اس میں اس لیے وہ ناکام رہے کہ افرنگ کے لات و منات سے کعبہ کا رختِ حیات نیا نہیں بن سکتا، یعنی مغربی تہذیب کی تقلید سے مسلمانوں کو زندگی نہیں مل سکتی، ترکوں کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں تھی اور جس کو وہ نئی سمجھتے ہیں وہ صرف افرنگ کا اتارا ہوا پرانا لباس ہے، ان کے سینہ میں نیا دم اور ان کے فکر و خیال میں نیا عالم نہیں تھا، اس لیے اس کو موجودہ عالم یعنی جدید تہذیب میں جو کچھ ملا، اسی کو اختیار کر لیا، اور موم کی طرح اس کے قالب میں ڈھل گئے، حالانکہ کائنات کی فطرت میں طرفگی ہے، اور اس میں بہت سی نئی چیزیں ہیں، زندگی تقلید سے نہیں قائم رہتی، زندہ دل قومیں خود زمانہ آفریں ہوتی ہیں، تقلید سے ان کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ اگر تم میں مسلمانوں کا دل و جگر ہے تو اپنے ضمیر اور قرآن پر نظر ڈالو، اس کی آیات میں سیکڑوں نئے جہاں پوشیدہ اور اسکی ایک ایک آن میں سیکڑوں زمانے مستور ہیں، بندۂ مومن خدا کی آیات میں سے ہے، زمانہ کے مختلف دور اسکے لیے لباس کی حیثیت رکھتے ہیں، جب کوئی زمانہ اور اس کا لباس

اس کے جسم پر پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اس کو نیا جہان اور نیا لباس عطا کرتا ہے، یعنی قرآن مجید ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات کی رہنمائی کے لیے کافی ہے، اس کی رہنمائی میں مسلمانوں کو اپنا جہان آپ پیدا کرنا چاہیے، دوسروں کی تقلید ان کے لیے باعثِ ننگ ہے،

چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست

چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانِ دیگرش

بعض اعتراضات کا جواب

اقبال پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ آفاقی اور قومی شاعر نہیں بلکہ اسلامی اور فرقہ پرست شاعر تھے، ان کی شاعری قومی و وطنی جذبات سے خالی ہے، اس کی انھوں نے مخالفت کی ہے، انھوں نے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے، اور ان کو جارحیت کی تعلیم دی ہے، اور وہ مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار چاہتے تھے، راقم نے اس کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو جنوری و فروری ۷۰ء کے معارف میں شائع ہوا ہے، اس مقالہ میں بھی ان کی اسلامی شاعری کو پیش کیا گیا ہے، اس سے اس اعتراض کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس پر سرسری نظر ڈال لی جائے۔

درحقیقت اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جن کی نظر ان کے پورے کلام پر نہیں ہے، وہ صرف اُن نظموں کو جو اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہیں، دیکھ کر فیصلہ کر دیتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، انکے افکار و تصورات اور تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے سیکڑوں مسائل پر لکھا ہے، ان سب کو پیش نظر رکھنے کے بعد صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ قومی شاعر بھی تھے، اسلامی بھی اور آفاقی بھی، انکو اپنے مذہب و ملت سے بھی محبت تھی، قوم و وطن سے بھی اور عالم انسانیت سے بھی، ان سب کے درد سے انکا دل دکھتا تھا اور

ایشیا کی غلامی پر ان کا دل بیقرار رہتا تھا، اپنی شاعری میں انھوں نے ان سب کو مخاطب کیا ہے، اور ان میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، محبت و تعلق کا دائرہ بہت وسیع ہے، ایک ہی وقت میں اپنے بیوی بچوں، اعزہ و اقربا، دوست و احباب، اپنی قوم و ملت، اپنے ملک و وطن اور پورے عالم انسانیت سے محبت ہوتی ہے، اور ایک کی محبت دوسرے کی محبت میں حائل نہیں ہوتی، البتہ انکی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے اپنے مذہب و ملت سے محبت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قوم و وطن کی محبت سے ان کا دل خالی تھا،

ان کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اس زمانہ کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اٹھارہویں صدی میں قریب قریب پورا ایشیا غلام ہو چکا تھا، اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کی حالت خاص طور سے بڑی ابتر تھی، اقبال نے ان سب کی بدحالی پر آنسو بہائے ہیں، اور ان میں زندگی، روح اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے مغربی تہذیب و مغربی سیاست کو جس طرح بے نقاب کیا ہے اور قوموں اور ملتوں کے عروج و زوال اور موت و حیات کا جو فلسفہ بیان کیا ہے وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ تمام مشرقی قوموں کے لیے یکساں سبق آموز ہے، انھوں نے سارے انسانوں سے محبت کی تعلیم دی ہے،

ایشیا پر ایک مستقل مثنوی لکھی ہے، جس کا نام ہی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ہے، اس میں انھوں نے بڑے جوش و جذبہ سے ایشیا کے شاندار ماضی، اس کے فضائل و کمالات اور عالم انسانیت پر اس کے احسانات کا ذکر کر کے اس میں روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے،

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست　　ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست
عشق را ما دلبری آموختیم　　شیوۂ آدم گری آموختیم

ہم ہنر ہم دیں زخاکِ خاور است　　رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است
وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب　　آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
ہر صدف را گوہر از نیسانِ ماست　　شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست
روحِ خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم　　خونِ آدم در رگِ خود دیدہ ایم
فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود　　زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود
داشتیم اندر میانِ سینہ داغ　　بر سرِ راہے نہادم ایں چراغ
اے زمینِ دولت و تہذیب و دیں　　آں یدِ بیضا بر آر از آستیں
خیز و از کارِ امم بکشا گرہ　　نشۂ افرنگ را از سر بنہ
نقشے از جمعیتِ خاور فگن
داستانِ خود ز دستِ اہرمن

یعنی دل کا سارا سوز و ساز اور درد و داغ، شراب اور ساغر سب ایشیا ہی سے پیدا ہوئے، عشق کو دلبری کا سلیقہ ہم نے سکھایا، اور آدم گری کا طریقہ ہم نے بتایا، علم و ہنر اور دین و مذہب سب سرزمین مشرق کی دین ہے، اس کی خاک پاک رشک گردوں ہے، ہم نے اسرار کائنات کا پردہ چاک کیا ہے، جو روز روشن کی طرح عیاں ہے، ہر سیپ کو موتی ہمارے نیساں سے ملے ہیں، اور ہر سمندر کو شوکت ہمارے طوفان سے حاصل ہوئی، یعنی دنیا کو جو کچھ بھی ملا ہے، وہ سب ایشیا سے ملا ہے، بلبل کے سوز میں ہم کو اپنی روح اور بنی آدم کا خون اپنی رگوں میں نظر آتا ہے، ہم پورے عالم انسانیت کو یکساں سمجھتے ہیں، اور ان سب کا درد ہمارے دل میں ہے، ہماری فکر رسا اسرار وجود کی جویا رہی ہے، اور ہم نے وجود کے تار پر پہلا زخمہ لگایا، یعنی اسرار وجود کا پہلے ہم نے

انکشاف کیا، ہمارے سینہ میں داغ کا جو روشن چراغ تھا، اُس کو ہم نے سرِ راہ رکھ دیا اور ساری دنیا کو اس کی روشنی سے منور کیا، پھر ایشیا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، اے دولت و تہذیب اور دین و مذہب کا گہوارہ! اپنا پرانا ید بیضا پھر آستین سے نکال اور اپنے کمالات سے دنیا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے، اور قوموں کے پیچیدہ مسائل کی گرہ کھول کر فرنگیوں کے سر کا نشہ اتار دے، اپنی جمعیت بنا کر اپنے کو اہرمن کے پنجہ سے آزاد کرلے،

اس سے بڑھ کر ایشیا کی عظمت کا ترانہ اور کیا ہو سکتا ہے، آفتاب کی حرارت و روشنی سے پوری کائنات کو جو فیض پہنچتا ہے اس کو گنانے کے بعد التجا کرتے ہیں،

تیرہ خاکم را سراپا نور کن در تجلیہائے خود مستور کن

تا بروز آرم شب افکارِ شرق بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

از نوائے پختہ سازم خام را گردشِ دیگر دہم ایام را

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

زندگی از گرمیِ ذکر است و بس حریت از عفتِ فکر است و بس

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

یعنی میری تیرہ و تار خاک کو بھی سراپا نور اور اپنی تجلیوں میں مستور کر دے تاکہ مشرق کے افکار و خیالات کی شب تار اور مشرق کے احرار کے سینہ کو روشن کر سکوں، اپنی نوا سے خام کو پختہ کرکے زمانہ کا رخ بدل دوں، مشرق کے خیالات فرنگ سے آزاد ہو جائیں اور وہ میرے سرود سے آب و رنگ حاصل کرے، زندگی ذکر کی گرمی اور آزادی خیالات کی پاکیزگی کا نام ہے، اس لیے پہلے خیالات کی تطہیر ضروری ہے، یعنی

اس کو بیرونی خیالات کی آمیزش سے پاک کرنا چاہیے، اس کے بعد نئے خیالات کی تعمیر آسان ہو جاتی ہے،

ایشیا اور ایشیائی اقوام پر ان کی اور نظمیں بھی ہیں "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی پوری مثنوی بھی ایشیا پر ہے، نمونہ کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں، نہ صرف ایشیا بلکہ پوری انسانیت کا درد اُن کے دل میں تھا، اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی،

ان کا دل اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت سے بھی خالی نہ تھا، ہندوستان کی عظمت پر انھوں نے متعدد نظمیں لکھی ہیں، جن کے لفظ لفظ سے اس کی عظمت و محبت ٹپکتی ہے، انکا ابتدائی دور کا وطنی ترانہ بہت مشہور ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے،

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اسکی وہ گلستاں ہمارا

دوسرے ترانے کے دو بند یہ ہیں،

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ان ترانوں کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور کے ہیں، بعد میں ان کے خیالات بدل گئے تھے، لیکن ہندوستان کی عظمت و محبت ان کے ہر دور کی نظموں میں نظر آتی ہے، جاوید نامہ میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے، اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں، ایک نظم میں ہندوستان

کی محبت ان الفاظ میں ظاہر کی ہے،

باز گو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ باکاہش نیرزد آسماں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ اے از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم

از غم ما کن غم او را قیاس
آہ از معشوقانِ عاشق ناشناس

یعنی ہندوستان کا قصہ پھر سناؤ، آسمان جس کی گھاس کی برابری بھی نہیں کرسکتا، جس کی مسجد کے ہنگامے خاموش ہوگئے، اور جس کے بتخانوں کی آگ بجھ گئی ہے، یعنی اُن میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی، جس کے لیے ہم نے دل خون کیا، اور جس کی یاد کو جان سے پرورش کیا ہے، میرے غم سے اس کے غم کا قیاس کر سکتے ہو معشوقوں سے اپنے عاشقوں کی ناقدری کتنی قابل افسوس ہے، آخری مصرعہ ان لوگوں پر لطیف طنز بھی ہو سکتا ہے جو اقبال کا دل وطن کی محبت سے خالی سمجھتے ہیں،

ایک نظم میں عظیم ہندوستان کی غلامی کا ماتم ان الفاظ میں کیا ہے۔

می ندانی خطۂ ہندوستاں — آں عزیز خاطر صاحب دلاں
خطۂ ہر ذرہ اش گیتی فروز — درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخم غلامی را کہ کشت — ایں ہمہ کردار آں ارواحِ زشت

ہندوستان کی سرزمین وہ ہے جو صاحب دل لوگوں کو عزیز ہے، جس کا ہر ذرہ دنیا کو روشن کرتا ہے، اب تک وہ خاک و خون میں تڑپ رہا ہے، اس کی مٹی میں غلامی کا بیج کس نے بویا، یہ سب بری روحوں کی بدکرداریوں کا نتیجہ ہے،

اسی نظم میں یہ ضرب المثل شعر ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم ننگ دیں ننگِ وطن

انھوں نے آزادی پر جتنی نظمیں کہی ہیں اُن کے مخاطب ہندو مسلمان دونوں ہیں ان سب میں ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا ہے، ایک نظم میں کہتے ہیں

اے ہمالہ اے اٹک اے رودگنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیر غیر
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں — ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب — انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے ہمالہ اے اٹک اے گنگا! یہ بے آب و رنگ زندگی کب تک، ہمارے بوڑھے فراست سے اور نوجوان محبت سے بے بہرہ ہیں، ساری دنیا آزاد ہے، اور ہم دوسروں کے نخچیر ہیں، ہماری اینٹیں دوسروں کی تعمیر کا سرمایہ ہیں، جب سے فرنگی کفر و دین یعنی ہندوستانیوں کے درمیان ثالث بنے اُس وقت سے کسی میں پانی اور سراب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی،

اس میں ہندو مسلم اختلاف اور اس کے اسباب کی طرف بھی اشارہ ہے،

جاوید نامہ میں عالم بالا میں جو تمثیلی مناظر دکھائے گئے ہیں، اُن میں مادر وطن کی کیسی پاکیزہ تصویر پیش کی ہے۔

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد — پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نور و نارِ لایزال — در دو چشم او سرور لایزل

حلۂ در بر سبک تر از سحاب — تار و پودش از رگِ برگِ گلاب

ما چنیں خوبی نصیبش طوق و بند — بر لبِ او نالہائے دردمند

آسمان شق ہوا اور اس سے ایک پاک زاد حور ظاہر ہوئی جس کی پیشانی پر لازوال نور اور اس کی آنکھوں میں لازوال سرور تھا، اس کے جسم پر ابر سے زیادہ لطیف لباس تھا، جس کا تانا بانا گلاب کی پنکھڑی کی رگوں سے بنا تھا، اس حسن و خوبی کے باوجود وہ طوق غلامی میں اسیر ہے، اور اس کے لبوں پر دردناک نالے ہیں،

یہ بڑی طویل نظم ہے، صرف چند اشعار مثالاً نقل کیے گئے، ان کے علاوہ اور نظمیں بھی ہیں مگر سب کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے،

انھوں نے ہندوستان کے صلحاء و اخیار کی ثنا و صفت میں بھی نظمیں کہی ہیں، رام چندر جی کی مدح یوں کہتے ہیں۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند — سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر — رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا

پاکیزگی میں جوشِ شجاعت میں فرد تھا

گوتم بدھ اور گرو نانک کی عظمت اور ان کے کارناموں کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے،

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا — ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے — دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مےِ پندار میں — شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا — نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے

ہند کے اک مردِ کامل[1] نے جگایا خواب سے

جاوید نامہ میں ایک مکالمہ ہے جس میں کائنات کے مسائل اور حقائق کے متعلق مولانا روم سے ایک عارف ہندی (جوگی) نے سوالات کیے ہیں اور مولانا نے اس کے جوابات دیے ہیں، یہ مکالمہ بہت طویل ہے، اس کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن عارف ہندی کا درشن کر لیجیے،

زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد — دیدہ از سرمہ اش روشن سواد

موے بر سر بستہ و عریاں بدن — گرد او مارے سپید حلقہ زن

آدمی از آب و گل بالاترے — عالم از دیرِ خیالش پیکرے

وقت او را گردشِ ایام نے

کار او با چرخِ نیلی فام نے

ان اشعار میں عارف ہندی کا کتنا بلند تصور ہے، مشہور فلسفی شاعر بھرتری ہری

[1] یعنی گرو نانک

اور سوامی رام تیرتھ پر بھی نظمیں کہی ہیں،

ہندوستان کے مختلف خطوں کی تعریف میں متعدد نظمیں ہیں، اپنے وطن کشمیر اور کشمیریوں کی تعریف میں کہتے ہیں،

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد　　صید را سودائے صیادی کہ داد

ایں برہمن زادگانِ زندہ دل　　لالۂ احمر ز روئے آں خجل

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش　　از نگاہ آں فرنگ اندر خروش

اصل شاں از خاک دامنگیر ماست

مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

اقبال خود بھی کشمیری برہمن تھے، موتی لال اور جواہر لال نے ہندوستان کی آزادی کا علم بلند کیا تھا، اس لیے اس دعوی کی صداقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے،

اقبال کو دریائے کاویری جیحون و فرات سے زیادہ عزیز تھا،

رود کاویری یکے نرمک خرام　　خستۂ شاید کہ از سیر دوام

در کہستاں عمرہا نالیدۂ　　راہ خود را از مژہ کاویدۂ

اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات　　اے دکن را آب تو آب حیات

اتنی مثالیں قوم و وطن سے محبت کے ثبوت کے لیے کافی ہوں گی، لیکن ان کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا، اس کی نگاہ نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت کے تنگ دائرے میں محدود نہ تھی، وہ پوری دنیا کو اپنا وطن اور ان کی بسنے والی قوموں کو اپنی قوم سمجھتے تھے، اور عالمگیر انسانی اخوت کے داعی تھے، اس پر انھوں نے مستقل نظمیں بھی کہی ہیں اور مختلف اشعار میں بھی اس کی تعلیم دی ہے،

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو　　اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی　　تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے　　حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ ناری ہو　　لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

اس سے بڑھ کر انسانی اخوت کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے، اس لیے یہ اعتراض سراسر غلط ہے کہ وہ اسلامی اور فرقہ پرست شاعر تھے، اور ان میں آفاقیت نہ تھی، البتہ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بہت سی نظمیں مسلمانوں کے لیے لکھی ہیں، اور ان میں انہی سے خطاب کیا ہے، لیکن اس سے ان کی آفاقیت اور حب وطن میں فرق نہیں آتا، ان نظموں میں بھی زندگی کے جو اصول اور قوموں کی موت و حیات، اور ترقی و تنزل کا جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ ساری قوموں کے لیے یکساں ہے؛ اس سے ہر قوم سبق حاصل کر سکتی ہے، ایسی نظمیں کم ہیں جو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہوں اور دوسری قوموں کے لیے اُن میں کوئی سبق نہ ہو، تاہم اس قسم کی نظموں سے انکار نہیں، اس مضمون میں بھی ان کو نقل کیا گیا ہے، اس کا سبب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ گذشتہ صدیوں میں پوری دنیائے اسلام کی حالت نہایت ابتر تھی، ان کی بیشتر حکومتیں مغربی قوموں کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھیں، یا ان کے دام میں اسیر تھیں، ان کی سیاسی طاقت بالکل ختم ہو چکی تھی، سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی روح بھی مردہ ہو چکی تھی، اس لیے اگر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح و تجدید کی طرف زیادہ توجہ کی تو کیا گناہ کیا، ان حالات میں دنیا کا ہر مصلح یہی کرتا ہے، گاندھی جی کا پیام محبت عالمگیر تھا، وہ پورے عالم انسانیت کے دوست تھے، اس کے باوجود اپنی قوم کو خصوصیت کے ساتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی، اور اس میں مذہبی روح بھی پیدا کی، بلکہ جو طبقے زیادہ پسماندہ تھے، ان کی طرف زیادہ توجہ کی، اس لیے اپنے مذہب و ملت

کی ہوا خواہی نہ قومیت و وطنیت کے خلاف ہے اور نہ آفاقیت کے۔

جارحیت کی تعلیم کا اعتراض بھی اس پہلو کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں زندگی کی حرارت ختم ہو چکی تھی، ان کے قوائے عملی شل ہو چکے تھے، وہ زندگی کے حقائق سے غافل اپنے حال میں مست و مدہوش تھے، اُن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے اگر اقبال نے ان میں توانائی پیدا کرنے کی کوشش کی تو کوئی جرم نہیں کیا، اس کے بغیر ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا تھا، اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اقبال کی جس تعلیم کو جارحیت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مغربی قوموں کے مقابلہ میں ہے، جنھوں نے مسلمانوں کی حکومتوں کو مٹایا تھا، اور ان کے مذہب و ملت اور تہذیب و ثقافت پر حملہ آور تھیں، اسلیے ان کا اصلی مقابلہ اُن ہی سے تھا، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس سے اقبال کا پورا کلام معمور ہے، اوپر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ بھی اس پر شاہد ہیں، اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کیجا سکتی کہ انھوں نے مشرقی قوموں کے مقابلہ کے لیے طاقت کی تعلیم دی ہو، اور اب تو یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ تمام مشرقی قوموں کا ہے، اس کے بغیر وہ مغربی قوموں کی جارحیت کا جواب نہیں دے سکتیں اور ان کا وجود قائم نہیں رہ سکتا، گو اب مشرق کا بڑا حصہ سیاسی حیثیت سے آزاد ہو چکا ہے، لیکن اقتصادی و معاشی اور تہذیبی حیثیت سے اب بھی مغربی طاقتوں کا غلام ہے، ان کے پنجہ سے رہائی کے لیے حصول طاقت کی تعلیم درحقیقت مظلوم انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے، ظالم و جابر کا مقابلہ پیام محبت اور اخلاقی وعظ و پند سے نہیں ہو سکتا، اس قسم کے الفاظ ظاہر میں کتنے ہی خوشنما ہوں لیکن عملی دنیا کے لیے بیکار ہیں، ورنہ دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کمزوری اور ناتوانی قوموں کے لیے پیام موت ہے۔

یہ مفتیِ تقدیر کا فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مگر اسی طرح بے قید قوت کا نشہ بھی دنیا کے امن و آشتی کے لیے خطرناک ہے، جس پر طاقتور قوموں کا عمل شاہد ہے، اس لیے اقبال نے اس کی مخالفت کی ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تاریخِ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس لیے وہ طاقت کو اخلاقی ضابطوں کا پابند بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ ایک طرف انھوں نے مسلمانوں کو طاقت پیدا کرنے کی تعلیم دی ہے، دوسری طرف اخلاقی درس بھی دیا ہے،

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یعنی طاقت اور شجاعت کے ساتھ عدل و صداقت بھی ضروری ہے، اس وقت وہ دنیا کے لیے خیر بن سکتی ہے،

عالم انسانیت کے لیے اُن کا پیام سراسر امن و آشتی اور اخوت و محبت کا ہے،

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اُخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

درحقیقت جنگ و مقابلہ، صلح و سالمت اور محبت و اخوت کے بارہ میں ان کی تعلیم بڑی متوازن اور عین فطرت کے مطابق ہے، اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مصافِ زندگی میں صورتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

قومیت اور وطنیت کے بارہ میں بھی اُنکے نقطۂ نظر میں یہی اعتدال و توازن ہے، قوم و وطن کی محبت کے متعلق انکے جو اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں ان سے انکے قومی اور وطنی جذبہ کا اندازہ ہو گیا ہوگا، لیکن انھوں نے اس قومیت اور وطنیت کی ضرور مخالفت کی ہے جس کا مقصد محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی برتری اور سربلندی ہو، جس کا لازمی نتیجہ کمزور قوموں کی پامالی ہے، ایک زمانہ میں اقبال یورپ کی نیشنلزم کے داعی تھے، لیکن پھر عالم انسانیت کیلئے اسکی ہلاکت آفرینی دیکھکر اس کے خلاف ہو گئے،

یورپ کی نیشنلزم نے قومیت اور وطنیت کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا ہے جس کا مقصد صرف اپنی قوم و وطن کی سربلندی اور دوسری قوموں پر اقتدار و تحکم ہے، اس پر مغربی قوموں کی پوری تاریخ شاہد ہے، اسی کی بدولت مشرقی قوموں کو صدیوں تک ان کا غلام رہنا پڑا، اور آج بھی بڑی قوموں میں جو کشمکش برپا ہے وہ اسی وطنی اور قومی فخر و غرور کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کا امن و امان خطرے میں ڈال دیا ہے، اس کے نتائج دیکھکر خود مغرب کے مفکرین اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اور وہ عالمگیر انسانی اخوت و محبت کی بنیاد پر ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں،

اور اب تو نسلی اور جغرافی قومیت اور وطنیت سمٹ کر پرونشلزم کی شکل اختیار کر لی ہے اور ایک ہی ملک کے مختلف حصے اپنی جداگانہ اور مستقل حیثیت کے مدعی ہو رہے ہیں، جس سے کوئی بڑا ملک متحد نہیں رہ سکتا، اقبال نے قومیت اور وطنیت کے اسی محدود تصور کی مخالفت کی ہے۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے تو اس سے

اس پر ایشیا اور افریقہ میں مغربی قوموں کی سیاست کی پوری تاریخ گواہ ہے اور اب تو اس قومی افتخار کے لیے خود ان قوموں میں کشمکش برپا ہے، اس لیے اس بت کو توڑے بغیر انسانی وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا،

اس کی خرابیوں کو دیکھکر مولانا ابو الکلام جیسے قوم پرور کو یہ کہنا پڑا :-

یہ بات عجیب و غریب ہے کہ قومیت جو استبداد و ملوکیت کے خلاف ایک محاذ کی حیثیت رکھتی تھی، آج خود اس پر جارحیت کا خول چڑھ چکا ہے، انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور امن پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی، آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے، اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اتحاد کے باوجود جب تک قومیت کے قیود سے آزاد اور اسکی سطح سے بلند و بالا نہ ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔"

رابندر ناتھ ٹیگور بھی مغرب کی جارحانہ قومیت کے خلاف اور عالمگیر انسانی اخوت کے داعی تھے،[1]

سیکولر نقطۂ نظر سے اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مذہب کے داعی اور اسلام کے مبلغ تھے، یہ بھی کوئی جرم نہیں، ہر صاحب مذہب کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے، اور اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ مادی تہذیب کی خرابیوں کی اصلاح مذہب ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے،

---

[1] انھوں نے ایک مستقل کتاب ہی نیشنلزم پر لکھی ہے جو تین مقالوں پر مشتمل ہے، "مغرب میں قومیت"، "جاپان میں قومیت" اور "ہندوستان میں قومیت"، ان میں ان ملکوں کی قومیت پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے، تیسرے مقالہ میں جو امریکہ میں پڑھا گیا تھا، ہندوستان اور امریکہ والوں کو مغرب کی جارحانہ قومیت کے مفہوم سے ہوشیار، اور ہندوستان کو اس کے خطرہ سے خبردار کیا تھا، اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

اور انسانیت کی فلاح اسی پر منحصر ہے اس لیے مذہب کی دعوت انسانی فریضہ اور انسانیت کی خدمت ہے، خود گاندھی جی، ٹیگور، ڈاکٹر بھگوان داس، رادھا کرشنن اور دوسرے ہندو مفکرین کا عقیدہ بھی یہی تھا، اور وہ مذہب، اخلاق اور روحانیت کے بڑے داعی تھے، رادھا کرشنن تو ہندو مذہب کے بڑے شارح و ترجمان سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے ہندو مذہب میں نئی روح پھونکی، جب وہ معارف و حقائق پر گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان عارف باللہ بول رہا ہو، اس لیے اگر اقبال نے مذہب یا اسلام کی دعوت دی تو کوئی جرم نہیں کیا،

اسلام کسی قوم و قبیلہ یا ملک اور وطن کا مذہب نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے، اسکی دعوت عام ہے، وہ سارے عالم کے لیے رحمت ہے، اس کا خدا تنہا مسلمانوں کا خدا نہیں بلکہ رب العلمین ہے، اقبال نے اسی حیثیت سے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اگر اس دعوت میں جبر و اکراہ کی تلقین ہوتی تو البتہ قابلِ اعتراض ہوتا جس کی کوئی مثال نہیں پیش کیجا سکتی، انھوں نے تو انسانی اخوت و محبت کی تعلیم دی ہے،

یہ بھی واضح رہے کہ مطلق مذہب یا مذہب اسلام کی دعوت سے اقبال کا مقصد مشرقی قوموں خصوصاً مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے مفاسد سے بچانا تھا کسی مذہب کی مخالفت یا اسکا اقتدار مقصود نہ تھا جس پر ان کا پورا کلام شاہد ہے، انھوں نے پورے مشرق کو علم و حکمت، تہذیب و تمدن اور مذہب و اخلاق و روحانیت کا گہوارہ بتایا ہے، اور دنیا پر اسکے احسانات شمار کرائے ہیں، ہندوستان کے ہادیانِ دین اور بانیانِ مذاہب کا عقیدت سے ذکر کیا ہے، ان سے متعلق نظمیں اوپر نقل کیجا چکی ہیں، البتہ ان کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ اس دور میں اسلام ہی دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتا اور اس کی مشکلات کا حل نکال سکتا ہے، اور اسکے دلائل بھی دیے ہیں، یہ بھی قابلِ اعتراض نہیں، ہر شخص مذہب

کو اس کا حق ہے کہ اپنے مذہب کو انسانی فلاح کیلیے دنیا کے سامنے پیش کرے، عیسائیوں نے اس کے باوجود کہ مذہب کو عملی زندگی سے الگ کر دیا ہے، انکے مبلغ ساری دنیا کو انسانیت کی فلاح کیلیے عیسائی مذہب کی دعوت دیتے پھرتے ہیں، بلکہ ہندو تک جنکا مذہب تبلیغی نہیں ہے وید پر عمل کی دعوت دیتے ہیں

مذہب سے الگ اخلاق و روحانیت کا تصور بے معنی ہے، اس کا سب سے بڑا معلم مذہب ہی ہے، اس کے بغیر تنہا اخلاق و روحانیت کی تعلیم کافی نہیں ہے، آج فلسفۂ اخلاق کی کتابوں سے کتب خانے معمور ہیں، لیکن وہ کسی انسانی طبقہ کی اصلاح نہ کر سکیں، اور آج دنیا میں اس کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب مذہب ہی کا فیض ہے، جو لوگ مذہب کے نام سے بھڑکتے ہیں، ان سے سوال ہے کہ جب جمہوریت، کمیونزم اور سوشلزم کے مدعیوں کو انسانی فلاح کے نام سے اپنے نظاموں کو پیش کرنے کا حق ہے تو آخر پیروانِ مذاہب کو اس کا حق کیوں نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ مذہب کا غلط استعمال بھی کیا گیا ہے، اور اس کے نام پر اختلافات اور خونریزیاں بھی ہوئی ہیں، لیکن اس کا ذمہ دار مذہب نہیں، بلکہ وہ مدعیانِ مذاہب ہیں جو اپنے مقاصد کے لیے مذہب کا غلط استعمال کرتے ہیں، مذہب تو سراسر امن و آشتی کا پیام ہے، اگر ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر عمل کریں تو دنیا کے بہت سے فساد خود بخود مٹ جائیں، پھر مذہب کے نام پر جتنی خونریزیاں دنیا کی پوری تاریخ میں ہوئی ہیں، اس سے کہیں زیادہ موجودہ نظاموں کی ایک ایک جنگ میں ہو جاتی ہیں، ان کی سفاکیاں تو چنگیز و ہلاکو سے بھی بڑھ گئی ہیں، انکے پاس انسانی ہلاکت کے ایسے سامان کہاں تھے کہ چشم زدن میں بڑے بڑے شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا دیں، مذہب کے نام پر اگر ایک طرف خونریزیاں ہوئی ہیں تو صحیح مذہب نے انسانیت کو سنوارا بھی ہے، اس کے اخلاقی و روحانی کارناموں سے کون انکار

کر سکتا ہے، اور آج دنیا میں اس کی جو روشنی نظر آتی ہے، وہ مذہب ہی کا طفیل ہے، اس کے مقابلہ میں موجودہ دور کی مادی تہذیب اور اس کے نظاموں نے انسانوں کی راحت و آسایش کے جتنے سامان فراہم کیے ہیں، اس سے کہیں زیادہ اس کی ہلاکت و بربادی کے اسباب مہیا کر دیے ہیں، اس نے انسانیت کو سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا ہے کہ اس کا دامن اخلاق و روحانیت سے بالکل خالی کر دیا، جو اس کا سب سے بڑا جوہر اور اس کی سب سے قیمتی متاع ہے، یہ حقائق اس قدر آشکارا ہیں کہ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، اس لیے دنیا مادی حیثیت سے جتنی ترقی بھی کر جائے، اس کو مذہب ہی کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے اگر انسانیت کو تباہی سے بچانا ہے تو ایک دن مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے انکی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد پہلے ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، پھر انکی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریات تعلیم، سیاست، عقیدت (لطیفت) (نبی عربی)، رفعت، تخیل، لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۰۰۰ صفحے، قیمت ۔ (طبع دوم)

"منیجر"

سیاست میں اسلام

(۳)

مترجمہ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

مشرقی افریقہ

مشرقی افریقہ کے مسلمان جو کبھی حکمرانی کے درجہ پر فائز تھے، اب ان کو محض غلام طبقہ کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ خطہ بہر حال مسلمانوں کا ہے اور ان کو وہیں رہنا ہے، ان کے جانے کی کوئی اور جگہ نہیں ہے، اگرچہ ان کے تعلقات دور دراز مسلم ممالک سے رہے ہیں، اور اب بھی قائم ہیں، یہاں مسلم فرقہ کو دو اہم مسئلوں کا سامنا ہے، ایک یہ کہ تیزی سے ترقی پذیر دنیا میں دوسری قوموں سے ہر محاذ پر مقابلہ کرکے اپنے لیے ایک بلند اور محفوظ پوزیشن بنانا (یہ مسئلہ صرف ان کا ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ہے) دوسرا مسئلہ ان کی نجی نوعیت کا ہے یعنی موجودہ مشرقی افریقہ میں جو سیاسی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے، اور جہاں تیزی سے ترقی و انقلاب کی طرف قدم بڑھ رہا ہے، مسلم عوام کا اپنے لیے نمایاں جگہ حاصل کرنا، یہ مسلم طبقہ افریقہ میں عرب اور اسلامی تہذیب کے پھیلنے سے وجود میں آیا ہے، وہاں اسلامی تہذیب کے پہلو بہ پہلو ایک غیر مذہبی اور ملحدانہ تہذیب بھی ہے، اس طرح یہاں کے مسلمان دو متضاد تہذیبوں (عرب مسلم اور دہریہ تہذیب) کے درمیان عبوری طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک تہذیب ان کو ان کے روحانی

اور آبائی مرکز عرب کی طرف کھینچتی ہے، اور دوسری افریقی قومیت میں ضم ہوجانے کی طرف مائل کرتی ہے، کیونکہ صدیوں سے یہ لوگ اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، اور صرف گذشتہ صدی میں اسلامی تہذیب وہاں وجود میں آئی ہے۔

مشرقی افریقہ کے مسلمان کئی نسلوں پر مشتمل ہیں، عرب نژاد ہیں یا افریقی النسل، یا دونوں سے مخلوط۔ یہ سب سنی العقیدہ مسلمان ہیں، ان کی زبان سواحلی ہے، یہ لوگ اپنے ملک کا ایک جز ولاینفک بن چکے ہیں، ایشیا کے سنی مسلمان عبادات میں تو ان سے مطابقت رکھتے ہیں، لیکن سماجی طور پر ان میں کافی فرق پایا جاتا ہے، یہاں کے سنی مسلمان شیعوں کو مسلمان نہیں مانتے، ان کی جڑیں دوسرے ممالک تک پھیلی ہوئی ہیں، اور لسانی و قومی رشتہ سے وہ اب بھی ایشیا سے منسلک ہیں، ان مسلمانوں کو سواحلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مسلمانوں کا روحانی مرکز افریقہ کے باہر ہے، اور ان میں سے اکثر اپنے کو عرب کہتے ہیں، لیکن وہ اپنی معاشرت، زبان، شادی بیاہ، مختلف نظریات اور بیرونی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوکر ملکی معاشرت میں پوری طرح گھل مل گئے ہیں، اس اشتراک نے ان کا رشتہ افریقی ساحل (سواحل) سے مضبوط کردیا ہے، اور انھوں نے افریقیوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے، اس طرح یہ صحیح معنوں میں اس سرزمین کے فرزند کہے جاسکتے ہیں، ان کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ قدامت پرستی مشرقی افریقہ کے مسلمان انتہائی روایت پرست ہیں، مثلاً کنزو۔ لمبا سفید قمیص نما بالائی لباس اور کفیہ (یعنی کشیدہ کاری کی ہوئی ٹوپی) پہنتے ہیں، جو کم تعلیم یافتہ طبقہ کا لباس ہے، مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ اس لباس کو مسجد اور مدرسہ جانے یا مسلم تقریبات کے مواقع پر استعمال کرتا ہے، عورتیں اب بھی برقعہ کا استعمال کرتی ہیں،

اگرچہ اس سختی سے نہیں جیسے عرب عورتیں، مدرسوں اور مسلم اسکولوں میں نظام تعلیم بھی روایتی ہے، لڑکے زمین پر بیٹھتے ہیں اور پرانے طرز سے درس و تدریس ہوتی ہے، افریقی مسلمان ممباسا کے قدیم شہروں ٹنگانگو، غازی، ممبروئی اور لامو میں خاص طور سے آباد ہیں، ان کی معاشرت خالص اسلامی ہے، اور وہ ہر اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں جس میں جدیدیت، مادیت، دہریت یا عیسائیت کا شائبہ بھی ہو،

۲۔ خود حفاظتی اور احتیاطی تدبیریں یہاں کے مسلمان مشنری اسکولوں کو ہمیشہ سے تبدیلی مذہب کا آلۂ کار شمار کرتے رہے ہیں، اب یہی شبہہ گورنمنٹ اسکولوں پر بھی ہونے لگا ہے، مثلاً ممبروئی کے شہر میں جو مالندی کے شمال میں ساحل پر واقع ہے، مسلم عوام نے اپنے شیوخ کی ہدایت پر اپنے بچوں کو گورنمنٹ پرائمری اسکولوں میں بھیجنے سے انکار کردیا اور انھیں مکتب میں بھیجنے پر مصر رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ اسکول میں مسلم بچوں کی تعداد پچیس ۲۵ سے زیادہ نہ ہوسکی اور اسکول بند کردینا پڑا، اس شہر میں عظیم الشان مسجدیں اور مدرسے ہیں، اور مشرقی افریقہ میں اسلامی علوم کا یہ سب سے بڑا مرکز ہے، اس شہر کے دروازے پر جلی حروف میں قرآن پاک کی یہ آیت تحریر ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ	اور (اے پیغمبر) نہ تو یہودی تم سے کبھی رضامند ہوں گے
وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ	اور نہ نصاریٰ ہی، تاوقتیکہ تم ان ہی کے مذہب کی
قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى	پیروی نہ کرو (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہیے کہ اللہ
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے، اور (اے پیغمبر) اگر تم
بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم (قرآن) آچکا ہے، ان کی
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ	خواہشوں پر چلے تو پھر تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا

نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار

شہر ممبروئی جنوبی عربی ساحل کا ایسا جزو معلوم ہوتا ہے جو مشرقی افریقہ میں جوڑ دیا گیا ہو، ان میں سے بہت سے لوگوں کی رشتہ داریاں حبان اور حضر موت میں ہیں، اب یہاں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، دیہی علاقوں کے عوام ساحلی شہروں میں کثیر تعداد میں آرہے ہیں، ان میں زیادہ تر عیسائی ہیں، اور ممباسا اب نمایاں مسلم اکثریت والا شہر نہیں رہ گیا ہے، اور دیہاتی علاقوں میں بھی اسلام کا اب وہ اثر دکھائی نہیں دیتا جو گذشتہ نسلوں میں تھا، مسلمانوں کا قدیم زرعی نظام بھی اب بدل رہا ہے، گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ قوانین حکومت میں یکسانیت پیدا کیجائے، اس سے قاضیوں کا زور بھی گھٹ گیا ہے، لیکن یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنی تہذیب پر ہر قسم کے حملے سے مدافعت کے لیے تیار رہتے ہیں، ۱۹۶۲ء میں جب صومالیہ کے وزیر اعظم نے ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ان مظالم کا تذکرہ کیا جو مسلمانوں کو پڑوسی ملکوں میں عیسائیوں کے ہاتھوں سہنے پڑ رہے ہیں تو کینیا کے مسلمانوں نے فوراً ہی جواب دیا کہ ان پر کوئی تشدد نہیں ہو رہا ہے، اور وہ اپنے ملک میں خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں، اور صومالیہ کے وزیر اعظم سے درخواست کی کہ وہ سیاست کو مذہب سے ملوث نہ کریں۔

۳- جمود مشرقی افریقہ کے مسلمان دینی امور میں کسی بھی تبدیلی کے شدید مخالف ہیں، وہ روزمرہ کی زندگی اور مذہبی معاملات میں بھی سخت روایت پسند ہیں، مذہبی شیوخ دینی علوم قدیم طرز سے پڑھاتے ہیں، مسجد میں استاذ شاگردوں کے سامنے زمین پر بیٹھتے ہیں، اور قرآن مجید کی تعلیم میں آیات قرآنی کی شرح سواحلی زبان میں کرتے ہیں، مشرقی افریقہ کے ایک ممتاز شیخ نے جو بڑے وسیع النظر اور جہاں گشت تھے، راقم سطور سے

بتایا کہ مشرقی افریقہ میں مسلم عوام کی دینی رہبری کے لیے کوئی مرکزی رہنما شخصیت نہیں ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے علوم دینیہ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا ہے، مشرقی افریقہ کی یونیورسٹی کی کونسل برائے "مذہبی امور" میں صرف ایک مسلم ممبر تھا، وہ بھی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا، اور جس طرح مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں زندگی کے موجودہ تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے شریعت کی نئی نئی توضیحات کی جارہی ہیں، اس طرح کا کوئی اصلاحی قدم مشرقی افریقہ میں نہیں اٹھایا گیا، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ "مذہبی اصلاح" کا لفظ ہی انھیں ناپسند ہے، ان کے نزدیک اس اصلاح کا مطلب صرف یہ ہے کہ سیکولر نظریات کو فروغ حاصل ہو، گورنمنٹ اسکولوں میں جو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہ بھی انھیں پسند نہیں، وہ ایسے مسلم ادارے چاہتے ہیں جن میں سیکولر مضامین کے قابل اساتذہ ہوں،

مشرقی افریقہ میں موجودہ رجحان سیکولر اسکولوں کی طرف ہے جس میں دینی علوم کے ماہرین الگ الگ مذاہب کی تعلیم دیتے ہیں، جو شیوخ یا اساتذہ روایتی خیالات سے انحراف کرنا چاہتے ہیں انھیں یہاں "نو آموز" کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی نو آموز اسلام اور عیسائیت کے ٹکراؤ کے مضر خطرات کو بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، ان میں تبلیغی جذبہ پاکستانیوں اور احمدیہ فرقہ کے لوگوں نے خاص طور سے پیدا کیا ہے، راقم سطور کو پاکستان کی ایسی تبلیغی جماعتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، جو گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں مسجدوں کو اپنا مرکز بنا کر تبلیغ کا کام انجام دیتی ہیں، قادیانیوں کی بڑی تعداد وہاں موجود ہے، ان کے سماجی اثرات ان کی تعداد کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں، اگرچہ عام طور سے انکو

کا فرخیال کیا جاتا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس فرقہ کے وسائل نشر و تبلیغ مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ وہ باطل اور گمراہ مذاہب کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتے ہیں، دینی طبقہ پریس میں اپنے خیالات کا اظہار صرف شادی، طلاق یا مسلم عورتوں کے لباس سے متعلق مسائل میں کرتا ہے۔ ان مسائل کے پیدا ہونے پر اخبارات میں مراسلوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔

۴۔ لسانی مسئلہ | اگرچہ مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کا تعلق مغربی افریقہ کے مسلمانوں کے مقابلہ میں عرب سے قریب تر ہے، لیکن وہ عربی زبان نہیں بولتے، بلکہ سواحلی کا استعمال کرتے ہیں۔ سواحلی زبان میں عربی الفاظ کی بکثرت آمیزش ہو گئی ہے، جو لوگ سواحلی بولتے ہیں، ان کو قرآن پاک کو سواحلی شرح کے بغیر سمجھنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے واعظ اور امام جب مسجد، ریڈیو، یا عوامی جلسوں میں تقریر کرتے ہیں تو کلام پاک کا عربی میں ترجمہ کرتے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کے مذہبی درس میں گانے اور شاعری کا سہارا لیا جاتا ہے، ان نظموں کا موضوع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور شہید امام حسینؓ ہوتے ہیں، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا توصیف و تعریف کیجاتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خداوند قدوس نے یہ سارا عالم اسی ذات بابرکات کی وجہ سے تخلیق کیا ہے۔ اس قسم کی نظموں کا ماخذ بوصیری کا قصیدہ بردہ ہے یہ قصائد

---

۵ مترجم، امام ابو عبداللہ محمد بن سعید البوصیری ساتویں صدی ہجری کے مشاہیر فضلا میں تھے، یکم شوال ۶۰۸ھ کو مصر کے ایک مقام دلاص میں پیدا ہوئے، لیکن زیادہ قیام چونکہ بوصیر میں رہا اس لیے بجائے دلاصی کے بوصیری کی نسبت سے مشہور ہوئے، تیرہ سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کیا

(باقی حاشیہ ص ۳۵ پر)

عوام میں حد درجہ مقبول ہیں، یہ عربی زبان میں ہوتے ہیں، اس کے باوجود اسکول کا ہر بچہ بآسانی اسے یاد کر لیتا ہے۔ ان نظموں میں اسلام کے ارکان، اس کی تاریخ، اور اخلاقیات سبھی کچھ ہوتا ہے، سواحلی زبان میں ان کے ترجمہ کے ذریعہ عوام کو دینی باتیں نہایت آسانی سے سکھائی جاتی ہیں، میلاد شریف ہر اسلامی مرکز میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے، اس میں کثرت سے لوگ شریک

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴) اور حدیث و کلام وغیرہ علوم متداولہ میں دسترس بہم پہنچائی، ذریعہ معاش خطاطی اور کتابت تھا، مبدء فیض سے شاعری کا ملکہ لے کر آئے تھے، اور قصیدہ گو کی حیثیت سے عربی ادب کے مطلع شہرت پر مہر تاباں بن کر چمکے، تمام ناقدین ادب نے امام بوصیری کی نادر الکلامی کا بالاتفاق اعتراف کیا ہے۔

قصیدہ بردہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک طویل قصیدہ ہے۔ اس کے سبب تصنیف کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ امام بوصیری پر جب فالج کا حملہ ہوا تو انھوں نے شان رسالت میں یہ قصیدہ لکھکر اس کے وسیلہ سے اپنی شفا کی دعا کی تھی، چنانچہ خداوند قدوس نے تندرستی عطا فرمائی، یہ قصیدہ دس فصلوں میں منقسم ہے، اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶۲ ہے، محققین نے ادبی محاسن (فصاحت، بلاغت، اور اسلوب بیان) کے ساتھ اس کی شفائیہ تاثیر کو تسلیم کیا ہے نکلسن نے لکھا ہے کہ "بردہ اپنے سادہ اور پرشکوہ اسلوب کی بدولت ہمیشہ کیف و سرور کے ساتھ پڑھا جائے گا"۔ عربی ادب کے ماہر مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رقمطراز ہیں "قصیدہ بردہ سوز عشق مضامین کی بلندی اور ادبی محاسن کی بدولت عربی نعت گوئی میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے"، اس قصیدہ کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ ساتویں صدی سے اب تک اس کی مختلف نوعیتوں کی ایک سو بیاسی (۱۸۲) شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ "نعیم"

ہوتے ہیں، اور ربیع الاول میں بہت سے لوگ خاص اسی مقصد (شرکت میلاد) کے لیے دور دراز کا سفر کرتے ہیں،

ساحل۔ مسلم تہذیب کا مرکز اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ مشرقی افریقہ میں مسلمان وہاں کی سماجی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں، اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اور ان کی تہذیب صرف سمندر کی ساحلی آبادیوں میں دیکھنے میں آتی ہے، اگر کسی کو ٹنگانکو یا کینیا ساحل کے مالندی شہر جانے کا اتفاق ہو تو اسے وہاں مسجدیں، مکاتب اور مسلم تہذیب کے دوسرے آثار دیکھنے میں آئیں گے، لیکن اندرون ملک ساحل سے سات آٹھ میل دور ممباسہ سے مالندی جانے والی سڑک پر کوئی بھی شخص کفیہ اور کنزو پہنے ہوئے دکھائی نہ دے گا، ان لوگوں کا اصلی وطن بحر ہند ہے، وہ اسی کے مقابل بسے ہوئے ہیں، اسکے دوسرے جانب ان کے آباء و اجداد کا وطن ہے، یہی سبب ہے کہ ان کے ناموں میں ایران و عرب کے پرانے ناموں مثلاً شیرازی، خزرجی اور کندی وغیرہ کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن آج کے دور میں جبکہ اتحاد اور مشترکہ قومیت کی آواز ہر طرف بلند ہو رہی ہے، ان ناموں کی وجہ سے ان لوگوں کو شیر و شکر ہونے میں دشواری پیش آتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس ملک کی نئی حکومتیں کہاں تک ان کو علیحدگی پسندی کی اجازت دیتی ہیں، یہ رجحان ان کی تاریخ کا ایک جزو ہے، ساحل کی معاشیات پر انہی لوگوں کا تسلط ہے،

عربوں اور افریقیوں میں تفریق مشرقی افریقہ کے مسلم عوام مخلوط النسل ہیں، حال ہی میں انکے اندر قومیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے، اس سے عربوں اور افریقیوں میں فرق ہو گیا ہے، میرے ایک عرب دوست نے بتلایا کہ یہ تفریق سیاستدانوں کی پیدا کردہ ہے، لیکن میرے خیال میں اس کا اصل سبب نسل کا اختلاط اور سماجی حالات ہیں، ہو سکتا ہے کہ

کسی حد تک سیاست کو بھی دخل ہو، افریقی مسلمان کو شکایت ہے کہ اگر عربوں کی ہدایت کے مطابق انھوں نے اپنے بچوں کو عیسائی مشنری اسکولوں میں نہ بھیجا تو ان کے بچوں کو صرف اپنی مزروعہ زمینوں پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا، مگر خود عرب اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار کے عیسائی اسکولوں میں بھیجتے ہیں، اس لیے آزادی کے بعد عربی النسل مسلمان ترقی کے میدان میں افریقی مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے ہیں، یہ جذبہ انقلاب زنجبار کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے، کیونکہ اس انقلاب میں عمانی اور عبادی عرب اور خود ان کے سلطان اپنا اقتدار و اثر کھو بیٹھے، کینیا میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے، جس کے باعث "افریقی مسلم ایسوسی ایشن" نام کی تنظیم وجود میں آگئی ہے، جو دوسرے اقدامات کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں کے شبینہ اسکول چلاتی ہے، ایک مسلم تعلیمی فنڈ بھی ہے، جس سے نادار بچوں کی فیس ادا کیجاتی ہے،

اپریل ۶۵ء میں عربوں اور افریقیوں کے درمیان یہ خلیج عید الاضحیٰ کے موقعہ پر ممباسا میں نہایت وسیع ہو گئی، اس مجمع میں ممباسا کے مسلمان میئر سانیفو کومبو نے تقریر کرتے ہوئے ان مسلمانوں پر نکتہ چینی کی، جو کینیا کی ترقی میں اپنا کردار پوری طرح ادا نہیں کرتے، انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا بھی ذکر کیا، اور زور دیا کہ طلبہ ملک کے موجودہ حالات و مسائل سے واقفیت پیدا کریں، اور ان دولتمند مسلمانوں پر نکتہ چینی کی جو ہوائی جہاز کے ذریعہ حج کرنے جاتے ہیں، جبکہ کینیا کو خود سرمایہ کی سخت ضرورت ہے، انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ "جب تک آپ کے ملک کو آپ کی مدد کی ضرورت ہے، آپ کا مکہ یہیں کینیا میں ہے، میئر نے یہ باتیں نہایت نیک نیتی سے کہی تھیں، اور اس میں کسی سیاسی شر پسندی کو دخل نہیں تھا، لیکن ان کی

تقریر کو عام طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا، اور ان پر اسلام کے ایک اہم ستون کو مسمار کرنے کی کوشش کا الزام لگایا گیا، لیکن میئر اپنی بات پر مصر رہے، اور جب مخالفین کی شورش حد سے بڑھ گئی تو مسانیفو کومبو نے ہتک عزت کا دعویٰ عدالت میں دائر کر دیا، جس میں وہ کامیاب ہو گئے،

مندرجۂ بالا مثال افریقی مسلمانوں کے خیالات کی ترجمان ہے، یہ لوگ افریقہ کو ہر چیز کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں، ان کو اپنے ہم وطن لیڈروں مثلاً ڈیگو، گرباں، کمبا اور کیکویو میں عربی النسل مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ کشش نظر آتی ہے، مشرقی افریقہ کے اسلامی طبقہ میں یہ جذبہ شدید تر ہوتا جا رہا ہے، اس سے یہ اندیشہ ہے کہ اس خطہ میں ایسا اسلام نہ پیدا ہو جائے جو عرب سے لسانی اور ثقافتی تعلقات بالکل منقطع کر لے اور محض نام کا لگاؤ عرب کے ساتھ رہ جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جذبہ محض قبیلہ اور وطن پروری کا شاخسانہ ہو،

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق ساحلی علاقہ سے ہے، اندرون ملک بھی ایسے علاقے ہیں جہاں انیسویں صدی میں ہاتھی دانت اور غلاموں کی تجارت کے ذریعہ عرب اثرات پہنچے تھے، مثلاً طبورہ یا تنزانیہ میں کیگوما اور بہت سی دوسری جگہوں پر اسلامی اثرات مختلف ذرائع سے نوآبادیاتی دور میں پہنچے تھے، جن سے کینیا اور یوگنڈا میں اسلام دور دور تک پھیلا اور تمام بڑے بڑے شہروں میں اسلامی فرقوں کو فروغ حاصل ہوا،

اندرون ملک کیلے اور دوسرے پھل دار درختوں کی کاشت کی شکل میں افریقی مسلمانوں کی جائدادیں ہیں، لیکن وہ خود کاشت نہیں کرتے، جانوروں کا ذبیحہ اور

مرغی پالنا ان کے مخصوص کام ہیں، اس کا انھیں معاوضہ بھی ملتا ہے، ساحلی علاقوں سے یوگنڈا اور مغربی کینیا میں سواحلی کی آمد و رفت رہتی ہے، اور اب مسلمان ساحلی علاقوں سے بڑھ کر دور دراز کے خطوں میں بھی پھیلنے لگے ہیں، ان کی آبادی برابر بڑھ رہی ہے، اور مشرقی افریقہ اور باہر سے آئی ہوئی تبلیغی جماعتوں کے اثر سے اسلام کو فروغ ہو رہا ہے،

سیاسی شیرازہ بندی کا وسیلہ

مشرقی افریقہ کے مسلمانوں نے ملک کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا ہے، اور وہ نوآبادیاتی نظام اور افریقہ کے عوام کو قریب لانے کا وسیلہ بنے ہیں، وہ تین چار زبانیں بولتے ہیں، سواحلی، انگریزی، عربی اور اپنے قبیلہ کی زبان اس سے یورپین افسروں کو عرب کے ساحلی حکمرانوں اور افریقیوں سے تعلقات قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی ہے، مگر اب جبکہ بیرونی حکمراں (برطانیہ اور فرانس) اپنی نوآبادیوں سے جا چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ مشرقی افریقہ کی حکومتیں کس حد تک مسلمانوں کا احسان مانتی ہیں، افریقیوں سے ان مسلمانوں کے تعلقات صدیوں پرانے ہیں، اور خود ان کا تمدن اتنا بلند ہے کہ وہ یورپین طرز فکر کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں،

اقلیتی طرز فکر

مشرقی افریقہ میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں، عرصہ دراز تک تو وہ غیر اسلامی افریقی بر اعظم کے ساحلی علاقوں سے وابستہ رہے ہیں، جہاں انھیں سخت مخالفانہ عناصر کا مقابلہ کرنا پڑا، جب انیسویں صدی میں یورپین یہاں آئے تو ان مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کو ایک طاقتور حلیف پایا، اب اس خطہ میں ان کا کوئی دشمن تو نہیں ہے، لیکن عیسائیت سے اسلام کو شدید خطرہ ہے، ساحلی علاقوں میں دوسرے ملکوں سے تلاش معاش میں آنے والوں کی وجہ سے مسلمان

اب بھی اقلیت میں ہیں۔

مشرقی افریقہ کے مسلمان اپنے مذہب کو اسلامی حکومت کے نظریہ سے قطع نظر ایک مقدس چیز شمار کرتے ہیں، یہ چیز عالم اسلام میں کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی، اس کا ثبوت ممباسا کے شیخ حیدر الکندی کی حال کی ایک تقریر سے ملتا ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد ملک کی حکومت کا وفادار رہنا چاہیے، خواہ حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ان کے لیے اصل اور لازمی چیز اسلام پر ایمان ہے، یہ چیز اسلام کو عیسائیت سے مشابہ کر دیتی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ ان دو عظیم مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت میں اتحاد کی شکل نکل آئے جن میں ابتک محض مخالفت ہی کا جذبہ رہا ہے، اس طرح دونوں میں صدیوں کی وسیع خلیج کو پر کرنے کا سہرا مشرقی افریقہ کے سر ہوگا،

مشرقی افریقہ سیاسی تحریکوں کی آماجگاہ ہے، یوگنڈا، کینیا اور تنزانیہ کی حکومتوں نے آزادی کے بعد ہی فیڈریشن بنانے کی تحریک چلائی تھی، لیکن اب وہ ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں، اور زنجبار میں انقلاب بھی ہو چکا ہے، تنزانیہ کی حکومت ڈکٹیٹرشپ کی راہ پر گامزن ہے، یوگنڈا میں بھی مخالف گروہوں کے درمیان کسی وقت بھی اقتدار کی جنگ شروع ہو سکتی ہے، ان تینوں ملکوں میں کینیا سب سے ترقی یافتہ ہے، لیکن وہاں بھی دو پارٹیوں کی جمہوریت اب ایک پارٹی میں بدل چکی ہے، مگر اب پھر دو پارٹیوں کے بننے کے امکانات نظر آرہے ہیں، لیکن یہ دونوں پارٹیاں ابتدائی "کانو" اور "کادو" جماعتوں سے مختلف نظر آتی ہیں،

لیکن کیا ان تمام سیاسی انقلابات کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے؟ یقیناً نہیں مشرقی افریقہ کا ایک عام شہری اپنے سیاسی عقائد میں اپنے مذہب، معاشیات اور سیاسی اصولوں سے زیادہ اپنے قبیلہ اور علاقے سے متاثر ہوتا ہے، یہ طرز فکر عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں میں مشترک ہے، اس کا ثبوت استعفا، تقرری اور سیاسی جماعتوں سے وفاداری میں مسلسل تبدیلی سے ملتا ہے، جب سیاست کا نام آتا ہے تو مشرقی افریقہ کا ہر فرد عیسائی یا مسلمان ہونے کے بجائے کسی مخصوص قبیلہ کا ترجمان بننے کو ترجیح دیتا ہے۔

(جیمس ایم رشے)

مسند ابن حنبل

کی

محققانہ شرح

مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی پندرہ سال سے مسند احمد بن حنبل کی شرح میں مصروف تھے، اس کا پہلا حصہ جو حضرت ابوبکرؓ کی احادیث کی شرح پر مشتمل ہے، "نہایۃ التحقیق فی شرح مسند ابی بکر الصدیق" کے نام سے چھپکر شائع ہو گیا ہے، اس کے آغاز میں اصول حدیث پر ایک محققانہ رسالہ بھی ہے۔

قیمت مجلد پندرہ ۱۵ روپئے۔ حسب ذیل پتہ سے ملے گی:-

(۱) مولانا شبیر احمد صاحب میرٹھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو۔

(۲) منشی شبیر حسن صاحب پوسٹ ماسٹر، موضع رائے وھنہ برانچ کھٹور (میرٹھ)

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

(استدراک)

از جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب سابق پروفیسر شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی

(۳)

آمین ۔ آمین کا لفظ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور اہم کلمہ ہے کہ وہ یہود، نصاریٰ اور اہلِ اسلام تینوں ملتوں کے ہاں عبادت الٰہی میں دعا کے موقع پر استعمال ہوتا ہے،

آمین عبرانی لفظ ہے، جو سب سے پہلے یہودیوں کے مذہبی نوشتوں میں پایا گیا ہے، اور ان کی عبادت گاہوں میں دعا کے موقع پر اب بھی استعمال ہوتا ہے،

آمین کا بنیادی مفہوم دعا، یا قول کو مؤکد کرنا ہے۔ یعنی قائل کہتا ہے کہ "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو"۔

انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آمین کا لفظ حضرت عیسیٰؑ نے بھی کئی بار استعمال کیا تھا، اور وہ اسے اپنے اقوال اور مواعظ کو مؤکد کرنے کے لیے کام میں لاتے تھے، کلیسا نے اس دستور کو اب تک جاری رکھا ہے، جب کبھی پادری کوئی دعا مانگتا ہو تو حاضرین اس پر آمین کہتے ہیں،

قاضی خفاجی (مؤلف شفاء الغلیل) اور دیگر لغت نویسوں نے آمین کے عربی

یا غیر عربی ہونے پر بحث کی ہے، اگر یہ علماء، یہود اور نصاریٰ کی مذہبی کتابوں کی طرف رجوع فرماتے جہاں آمین کا لفظ بہت پہلے استعمال ہو چکا ہے تو انھیں اس بحث کی ضرورت پیش نہ آتی،

اہل اسلام کے ہاں بھی آمین کا لفظ تقریباً ان ہی معنوں میں مستعمل ہے جنھیں یہود و نصاریٰ استعمال کرتے ہیں، اور آمین کا لفظ خاص کر سورۂ فاتحہ کی تلاوت یا قرأت کے بعد آہستہ یا پکار کر کہا جاتا ہے۔

روم ۔ الروم ۔ قرآن مجید کی سورۃ الروم میں "الرُّوم" کا جو لفظ آیا ہے، اس سے وہ رومی قوم مراد ہے جس کا نام اس کی سلطنت کے پایۂ تخت رومہ (Roma) سے مشتق ہے، رومہ کا شہر اب بھی اٹلی کا دار الحکومت ہے، جسے انگریزی میں Rome لکھتے ہیں،

رومی قوم کا شمار قدیم زمانے کی مشہور اقوام میں ہوتا ہے، اور ان کی ایک مدوّن تاریخ ہے، ان کی حکومت و سلطنت کی ابتدا اٹلی کے ملک سے ہوئی تھی، لیکن رومی سلطنت نے بڑھتے بڑھتے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کے وقت فلسطین اور شام کے ملک رومیوں ہی کے زیرنگیں تھے،

آگسٹس (۶۳ء قبل مسیح تا ۱۴ء) رومی سلطنت کا پہلا حکمران تھا جو امپرر (Imperatur) کہلایا، آگسٹس (Augustus) اور اس کے جانشینوں نے یکے بعد دیگرے قیصر (Caesur) کا لفظ اختیار کیا، یہاں تک کہ "قیصر" رومی فرمانرواؤں کا خصوصی لقب بن گیا، عرب مورخین نے رومی حکمرانوں کو قیصر ہی کے نام سے یاد کیا ہے، اور اپنے قواعد کے مطابق اس کی جمع قیاصرہ بنالی ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ لاطینی میں حرف C کا تلفظ کاف سے کرتے تھے، اسلیے عربی کا قیصر لاطینی Caesar کے تلفظ کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے، ہمارے یہاں انگریزوں کی پیروی میں Caesar کا تلفظ سیزر کرتے ہیں، جو اصل سے بہت دور ہو گیا ہے،

عیسوی دین فلسطین سے نکل کر آس پاس کے ملکوں میں رفتہ رفتہ پھیلتا گیا، یہانتک کہ اطالیہ میں بھی پہنچ گیا، اور قیصر قسطنطین (Constantine) نے اسے قبول کر لیا، اس نے بزنطیم کو اپنا دارالحکومت بنایا، جو اس کے نام پر قسطنطنیہ کہلایا، [illegible] میں رومی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک مغربی حصہ جس کا پایہ تخت روم تھا، اور دوسرا مشرقی حصہ جس کو "مشرقی رومی سلطنت" (Eastern Rome Empire) کہتے ہیں اور جس کا مستقر قسطنطنیہ تھا، مورخوں نے اسے "بزنطینی سلطنت" (Byzantine Empire) بھی کہا ہے، ظہور اسلام کے بعد عربوں کو جس رومی سلطنت سے سابقہ پڑا وہ یہی مشرقی رومی سلطنت تھی، جس میں ایشیائے کوچک، شام، فلسطین اور مصر کے ملک داخل تھے۔

مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی مملکت کے درمیان اکثر جنگ و جدال کا بازار گرم رہتا تھا، کبھی ایک فریق غالب آتا اور کبھی دوسرا، سورۂ روم میں فریقین کی اسی کشمکش کی طرف اشارہ ہے،

جن ملکوں میں رومی سلطنت قائم تھی، عربوں نے انھیں "بلاد الروم" کہا ہے، ایشیائے کوچک کو بلاد الروم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لیے روم کا لفظ اس پر ایسا چسپاں ہوا کہ وہاں کی ہر ایک چیز رومی کہلانے لگی، مثلاً سلاجقہ کی جو شاخ ایشیائے کوچک پر حکمراں تھی، اسے مورخوں نے "سلاجقۂ روم" کہا ہے، مولانا جلال الدین اس وجہ سے

رومی کہلائے کہ وہ وہاں کے شہر قونیہ میں رہتے تھے، عثمانی خاندان کے سلاطین کو اسلیے "سلطانِ روم" کہتے تھے کہ وہ قدیم رومی علاقوں کے مالک تھے،

جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے، عربی زبان کے اکثر الفاظ سہ حرفی مادوں سے مشتق ہیں، یہ قاعدہ اُن اسماء میں بھی جاری ہے جو عربوں کے ہاں مختلف قوموں کے لیے مروج ہیں، مثلاً عرب، عجم، فُرس، ترک، تتر (تاتاری)، خزر، حبش، زنج (زنگی)، قبط، روس، مجر (Magyar یعنی ہنگیرین)۔ یہ سب نام ثلاثی ہیں، روم کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیجیے،

سِجِّیل ۔ سجیل کے معنی ہیں کھنگر یعنی مٹی کا ڈھیلا جو منجمد ہو کر پتھر کی طرح سخت ہو جائے۔

سجیل کا لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۂ ہود میں ہے:

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ — اور ہم نے اس (بستی) پر پتھر کے کھنگر برسائے

سورۃ الحجر میں ہے: وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۔ اور سورۃ الفیل میں ہے

تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ — ابابیل ان پر (یعنی اصحاب فیل پر) پتھر کے کھنگر برسا رہے تھے۔

سورہ الذاریات میں جہاں گذشتہ انبیاء کا ذکر ہے وہاں ایک آیت میں ہے:

لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ — یعنی ہم ان پر مٹی کے پتھر یعنی سنگریزے برسائیں گے۔

یہاں حجارہ کے ساتھ طین یعنی مٹی کا جو ذکر آیا ہے، اس سے بھی "حجارۃٌ من سجیل

کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے، اور اس کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے۔

علماے لغت اور اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اپنے اصل کے لحاظ سے سجیل عجمی کلمہ ہے، اور سنگِ گِل کا معرب ہے، سنگ کے معنی پتھر اور گل کے معنی مٹی کے ہیں، چنانچہ ابن قتیبہ، جوالیقی، راغب اصفہانی اور قاضی خفاجی اور مفسرین میں سے قاضی بیضاوی اور امام سیوطی کی یہی رائے ہے کہ سجیل ایک فارسی لفظ کا معرب ہے، امام طبری اور قاضی بیضاوی نے اس بارے میں چند اور اقوال بھی نقل کیے ہیں لیکن وہ چنداں درخورِ اعتنا نہیں۔

مجاہد بھی اس کے قائل تھے کہ سجیل کا لفظ فارسی الاصل ہے، امام سیوطی نے اتقان میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "سجیل بالفارسیۃ اولھا حجارۃ و آخرھا طین"۔

قلم - قلم کا لفظ قرآن مجید میں ۲ دو مرتبہ بصورتِ مفرد اور دو مرتبہ بصورتِ جمع (اقلام) استعمال ہوا ہے۔

قلم لکھنے کا وہ آلہ ہے جسے نَے یا نیزہ کو تراش کر تحریر کے کام میں لاتے ہیں، جمع اس کی اقلام آتی ہے، قلم کے چند مشتق کیے گئے ہیں، مثلاً قُلامہ وہ تراشہ ہے جو قلم بنانے میں نکلتا ہے، اور مِقلَمہ قلمدان کو کہتے ہیں۔

قلم کے اصلی لغوی معنے نَے یا نیزہ کے ہیں، جسے پنجابی میں "کانا" اور انگریزی میں Reed کہتے ہیں، قاموس میں ہے کہ القلمُ الیراعۃُ یعنی قلم کے معنے نیزہ کے ہیں، دوسرے معنے بعد میں پیدا ہوئے۔

قلم کا لفظ بعض اوقات رسم الخط کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ابن الندیم نے الفہرست کے ابتدائی باب میں جہاں مختلف قوموں کے خطوط (Scripts) کا ذکر کیا ہے

وہاں قلم کا لفظ رسم الخط کے لیے استعمال کیا ہے، چنانچہ حِمیر کے خط کو "القلم الحمیری" اور سریانی رسم الخط کو "القلم السریانی" لکھا ہے۔

قلم کا لفظ عربی کے علاوہ دوسری سامی زبانوں مثلاً آرامی، سُریانی اور حبشی میں بھی پایا جاتا ہے، اور فارسی، ترکی، اردو اور پشتو میں بھی اسی معنے میں مستعمل ہے، جو غالباً عربی ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

قلم کا لفظ یونانی اور لاطینی زبانوں میں بھی موجود ہے، یونانی میں اُسے Kalamos اور لاطینی میں Calamus لکھتے ہیں، یہ واضح رہے کہ یونانی لفظ کے آخر میں جو os ہے وہ حالتِ رفعی (nominative case) کی علامت ہے۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ لفظ لاطینی میں یونانی کے ذریعہ آیا ہوگا، کیونکہ رومیوں نے اپنے اکثر علوم یونانیوں سے حاصل کیے تھے، یونانی ان سے بلحاظ زمانہ اقدم تھے، اور علمی لحاظ سے اُن پر فوقیت رکھتے تھے۔

قلم کا لفظ سنسکرت میں بھی پایا جاتا ہے، اور اس کا املاء رومن حروف میں بصورت Kalamas کر سکتے ہیں، اور اس کے معنے بھی وہی ہیں جو عربی اور دیگر زبانوں میں ہیں، یعنی

(۱) نَے یا نیزہ Reed

(۲) لکھنے کا آلہ جو نَے سے بنایا جاتا ہے۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلم کا لفظ بہت سی سامی اور آریائی زبانوں کا مشترک لفظ ہے، اتنی کثیر اور اہم علمی زبانوں میں اس لفظ کا پایا جانا قابلِ غور امر ہے، یہ محض توارد یا توافق نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا فیصلہ

کرنا مشکل ہے کہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے کس قوم یا ملک کی زبان میں ہوا، اور دوسری قوموں کی زبانوں میں کب اور کیسے پھیلا، مغربی علماء کا قول ہے کہ اسکی اصل یونانی ہے لیکن یہ قول مزید تحقیق اور تصدیق کا محتاج ہے۔

قرآن مجید اور قلم قلم کے لیے یہ بات کیا کم باعثِ شرف ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلی وحی میں استعمال ہوا، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں نازل ہوئی تھی، چنانچہ ارشاد ہوا:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ — (اے نبی) پڑھ ساتھ نام اس پروردگار
خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ — کے جس نے (تمام کائنات) کو پیدا کیا،
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي — اور انسان کو خون بستہ سے بنایا، پڑھ اور
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ — جان لے کہ تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے
مَا لَمْ يَعْلَمْ — جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا،
اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

قمیص - قمیص کے معنے ہیں کرتہ یا پیراہن۔

قمیص کا لفظ قرآن مجید میں چار مرتبہ آیا ہے، اور صرف حضرت یوسفؑ کے قصہ میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۂ یوسف میں ہے کہ

اِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ — اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو،
وَاِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ — اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو،

حدیث نبوی میں بھی ایک دو مرتبہ آیا ہے، مثلاً ایک روایت ہے کہ

اَنَّهُ قَالَ لِعُثْمَانَ اِنَّ اللّٰهَ سَيُقَمِّصُكَ — یعنی رسول خدا (صلعم) نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ

قَمِيصًا وَاِنْ اَرَادُوكَ عَلٰى خَلْعِهِ — اللہ تجھے عنقریب ایک کرتہ (یعنی خلافت
فَلَا تَخْلَعْهُ — کا جامہ) پہنائے گا، اور لوگ چاہیں گے
کہ تو اسے اتار دے لیکن اسے ہرگز نہ اتارنا۔

ابو الولید ازرقی کی تالیف "اخبار مکہ" کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قمیص الکعبہ کا لفظ خانہ کعبہ کے غلاف کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

علمائے لغت نے قمیص کو عربی قرار دیا ہے، چنانچہ جوالیقی، سیوطی اور خفاجی نے اسے معرب الفاظ میں شمار نہیں کیا ہے، یعنی یہ لفظ ان کے نزدیک خالص عربی ہے، راغب اصفہانی (مفردات القرآن) اور ابو السعادات ابن الاثیر جزری (صاحب النہایہ) نے بھی اس لفظ کے اشتقاق سے بحث نہیں کی ہے۔

لیکن مغربی محققین کی رائے ہے کہ قمیص کا لفظ لاطینی کلمہ Camisia سے ماخوذ ہے جس کے معنے "سوتی کرتہ" ہیں، اور یہ لاطینی لفظ شام میں ان رومی تاجروں کے ذریعے سے رائج ہوا تھا، جو پانچویں صدی عیسوی میں شام کے مختلف شہروں میں آباد ہوگئے تھے، اور اس کے بعد عربوں نے یہ لفظ اہل شام سے اخذ کیا۔

فرانسیسی لفظ شمیز (Chemise) بھی اسی لاطینی کلمہ سے ماخوذ ہے، شمیز وہ ہلکا سا سوتی یا ریشمی جامہ ہے جو خواتین کپڑوں کے نیچے بنیان کے طور پر پہنتی ہیں، اسلیے قمیص اور شمیز کی اصل ایک ہے، لیکن یہ لفظ ہمارے ہاں دو مختلف راستوں سے آئے ہیں، اسلیے انکا مفہوم بھی ایک دوسرے سے جدا ہے، ہمارا مطلب ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہے۔

Late Latin : Camisia

French : Chemise — Arabic : قمیص

Urdu : شمیز — Urdu : قمیص

عربوں کا پیراہن یعنی ثوب ٹخنوں تک ہوتا ہے، اس کے برخلاف قدیم مصریوں کا پیراہن
صرف گھٹنوں تک ہوتا تھا، اس لیے قرآن حکیم نے اس موقع پر ثوب کی بجائے قمیص کا جو لفظ
استعمال کیا ہے، وہ بلا وجہ نہیں ہے، اس کے استعمال میں مقامی حالات کی رعایت رکھی گئی ہے،
اسی طرح سورۂ یوسف میں بھی چند ایسے الفاظ آئے ہیں، جن میں مصر کے مخصوص حالات
کی رعایت پائی جاتی ہے، اور جن پر انشاء اللہ آیندہ کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

نصاریٰ۔ نصاریٰ سے مراد یسوع ناصری کے پیرو یعنی عیسائی یا مسیحی ہیں،
نصاریٰ کا لفظ اس معنے میں قرآن مجید میں چودہ[14] مرتبہ آیا ہے، اور سورۂ آل عمران
میں ایک مرتبہ بصیغۂ واحد یعنی نصرانی کی صورت میں بھی استعمال ہوا ہے،
حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بھی عیسائیوں کے لیے نصاریٰ ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،
ہم لفظ ناصری کی تشریح میں بیان کر چکے ہیں کہ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کا خاندان مصر
سے واپسی کے بعد ناصرہ (Nazareh) کے قریہ میں مقیم ہوا تھا، اور آپ نے
تبلیغ کے لیے یہیں سے ظہور فرمایا تھا، اسی لیے وہ اپنے معاصرین میں یسوع ناصری
(Jesus of Nazareh) کہلائے، چنانچہ انجیل میں کئی مرتبہ اسی نام سے آپ کا
ذکر آیا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ناصرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ

من الناصرة اشتق اسم النصاریٰ	یعنی نصاریٰ کا نام ناصرہ سے مشتق ہے۔

ہماری رائے میں نصاریٰ کے اشتقاق کے بارے میں یہی قول راجح ہے،
راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عیسائیوں

کو نصاریٰ اسلیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نحن انصار اللہ کا نعرہ لگایا تھا جیسا کہ قرآن پاک میں
مذکور ہے، لیکن راقم الحروف کی رائے میں یہ قول اس وجہ سے ضعیف اور ناقابل قبول ہے کہ نصاریٰ
اور انصار اپنی اپنی جگہ جمع کے دو مستقل صیغے ہیں، نصاریٰ فعالی کے وزن پر ہے اور انصار
افعال کے وزن پر، اس لیے ایک کا دوسرے سے مشتق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،
ہم سطور بالا میں اس بات کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اشتقاق کے لحاظ سے نصاریٰ
کا تعلق ناصرہ یا ناصری سے ہے، میرے نزدیک اس لفظ کی ترکیب اس طرح واقع ہوئی ہو گی کہ ناصرہ اور ناصری
دونوں کے حروف اصلیہ میں ہیں یعنی نصر [illegible] انہی تین حرف کو لیکر ان سے فعالی کے وزن پر جمع کا صیغہ نصاریٰ بنا لیا،

یم۔ یم کا لفظ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں سمندر کے معنی میں سات مرتبہ
آیا ہے، اور صرف حضرت موسیٰ اور فرعونِ مصر کے قصہ کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے،
سورۃ القصص میں ہے کہ

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اسے دودھ پلا اور جب تجھے اس کی جان کا خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا۔

پھر آگے چل کر فرمایا

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ	پس ہم نے اس پر (یعنی فرعون پر) اور اسکے لشکروں پر گرفت کی اور انکو سمندر میں پھینک دیا۔

سورۃ الاعراف میں ہے کہ

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ	پس ہم نے ان سے انتقام لیا اور انکو سمندر میں غرق کر دیا۔

قم کی طرح یم کا لفظ بھی عربی اور قدیم مصری زبان میں اشتراک ہے، یعنی مصری زبان میں بھی یم کا لفظ سمندر کے معنے میں پایا جاتا ہے، عصر حاضر کے محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں مستعار لیا گیا ہے،

قبطی میں بھی جو قدیم مصری زبان کی موجودہ صورت ہے، یم کا لفظ بدستور مستعمل ہے، لیکن اس کی میم مشدد نہیں، غالباً قدیم مصری میں بھی مشدد نہ تھی۔

عرب علماء کا ابتداہی سے یہ خیال ہے کہ یم کا لفظ غیر عربی ہے، امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ ابن قتیبہ نے یم کو سریانی بتایا ہے، اور الجوالیقی نے بھی اسے سریانی کہا ہے، لیکن شیدلہ کا قول ہے کہ قبطی ہے، اور یہی قول قرین صحت ہے،

یہ امر قابل غور ہے کہ یم کا لفظ قرآن پاک میں صرف حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے قصہ میں آیا ہے، اور اس سلسلہ میں کبھی دریائے نیل اور کبھی سمندر کے لیے استعمال ہوا ہے، ورنہ باقی مقامات میں سمندر کے لیے بالعموم بحر کا لفظ آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے مصر کے واقعات کے بیان میں وہاں کے مقامی الفاظ کے استعمال کو ملحوظ رکھا ہے۔

مقالات سلیمان جلد سوم

قرآنی اشارے اور علم الارض

از جناب بدیع الزمان صاحب اعظمی

دنیا کے سارے مذاہب اس امر پر متفق ہیں کہ صحیفۂ قدرت خدا کا فعل ہے، اور الہامی کتب خدا کے اقوال کا مجموعہ، جب یہ ایک حقیقت ہے تو ممکن نہیں کہ خدا کے قول اور فعل میں مطابقت نہ ہو، قرآن کریم نہ صرف ہمارے لیے نور ہدایت ہے، بلکہ اس نے صحیفۂ قدرت کے رموز اشاروں میں بیان کرکے ہمارے لیے تحقیقات کی راہیں بھی کھول دی ہیں، اس نے کہیں کہیں تاریخ عالم کے کسی واقعہ کی طرف لطیف اشارہ کرکے کسی اہم بات کی تشریح بھی کی ہے، مثلاً حضرت سلیمانؑ اور بلقیس (ملکۂ سبا) کا قصہ بیان کرنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ اسے یقین دلانا چاہتے تھے کہ جن اجرام فلکی کی خوبصورتی اور بے پناہ تابندگی کے آگے وہ سربسجود ہوتی ہے ان کے پیچھے قادر مطلق کا ایک زبردست ہاتھ ہے، جو کام کر رہا ہے، چنانچہ جس وقت ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے بلوری محل میں داخل ہوئی تو فرش پر بہتا ہوا پانی دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی، تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ چلی آؤ، یہ پانی نہیں ہے، یہ تو شیشے کا فرش ہے، پانی تو اس کے نیچے بہ رہا ہے، تم نے شیشہ کو پانی سمجھ لیا تم کو دھوکا ہوا، ملکہ اس اشارے کی تہ تک پہنچ گئی، اس کی سمجھ میں آگیا کہ جس طرح شیشہ پانی نہیں ہے، اسی طرح اس کا معبود چمکتا ہوا سورج نہیں ہے، بلکہ وہ قادر مطلق ہے جو مجسم نور ہے اور سورج کو نور بخش رہا ہے،

خدائے جل شانہ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں کائنات اور اسکی مختلف اشیاء کے بارے میں جو بھی اشارے کیے ہیں اُن کی صداقت مسلّم ہے، مثلاً پہاڑوں کے متعلق یہ ارشاد کہ

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ (کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا۔)

یا شق القمر کے متعلق یوں ارشاد فرمایا

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ (قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا)

آئیے ان اشاروں کی صداقت کا جائزہ علم الارض کی روشنی میں لیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کرۂ ارض نظام شمسی کے سیارگان میں ایک اہم سیارہ ہے، دنیا کے سائنسدان اور ماہر علم طبقات الارض اس امر پر متفق ہیں کہ نظام شمسی کے ۹ عدد سیاروں کا جنم آج سے تقریباً چھ ارب برس قبل ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک بہت بڑا ستارہ ہمارے سورج کے قریب سے گذرا۔ اس نے اپنی قوت کشش سے سورج سے کچھ مادہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ چونکہ وہ ستارہ بہت تیزی سے آگے نکل گیا لہٰذا وہ خارج شدہ مادہ سورج کی کشش سے دور نہ جاسکا اور سورج کا طواف کرنے لگا۔ اسی اثناء میں وہ ۹ حصوں میں منتشر ہوگیا جنھوں نے ۹ عدد سیاروں کی شکل اختیار کرلی۔ خدانخواستہ اگر وہ ستارہ سورج سے ٹکرا گیا ہوتا تو پھر نظام شمسی کی تشکیل ہی نہ ہو پاتی۔ مگر یہ تو قدرت کے سوچے سمجھے پلان کے تحت ہوا۔ جب قدرت چاہے گی کہ اجرام فلکی آپس میں ٹکرا جائیں تو پھر وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر قیامت برپا کردیں گے۔

کرۂ ارض مادر سحابیہ (سورج) سے جدا ہونے کے بعد خود دہکتے ہوئے گیس کا ایک گولہ تھا۔ اس عالم میں اس نے اپنی ابتدائی عمر کے کروڑوں برس بسر کیے۔ اسی اثناء میں اس کے بطن سے ہمارے چاند کا جنم ہوا، مگر اب یہ نظریہ دم توڑتا نظر آرہا ہے، اس واسطے کہ ہمارے بہادر خلانوردوں کی ٹیم اپنے ہمراہ چاند کی مٹی اور چٹانوں کے جو نمونے لائی ہے، ان کے اجزائے ترکیبی کی جانچ کرنے کے بعد یہ مفروضہ قائم کیا جارہا ہے کہ کرۂ ارض اور چاند دونوں کا جنم ایک ہی ساتھ ہوا ہوگا، اور ان کی عمریں لگ بھگ ساڑھے چار ارب برس ہوں گی، بہرحال اصلیت جو بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ سحابی حالت میں رہتے ہوئے اور سورج کا طواف کرتے ہوئے کرۂ ارض کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوکر ٹھوس ہوتی گئی، بالآخر آج سے تقریباً ڈیڑھ ارب برس قبل ایک ہی براعظم کا ظہور ہوا، جسے پین جیا کہتے ہیں، جب اس براعظم کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوکر ٹھوس ہوتی گئی تو اس میں دراڑیں پڑتی گئیں، جو پھیل کر اور ٹوٹ کر موجودہ براعظموں کے جنم کا سبب بنیں۔ جیسا کہ ذیل کی شکل سے ظاہر ہے۔

براعظم پین جیا:-

براعظم پین جیا زمین کی ناگہانی اندرونی حرکت سے پاش پاش ہوگیا، اس کے منتشر ٹکڑے آج مختلف براعظموں کے نام سے موسوم ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ مختلف براعظم جو کسی وقت ایک دوسرے سے ملحق تھے، آج ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر کیسے ہوگئے، اس ضمن میں مشہور سائنسدان اور ماہر علم طبقات الارض مسٹر وجینر کا نظریہ براعظمی بہاؤ (Continental Drift) ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے، یہ بات قرین قیاس ہے کہ جس طرح کرۂ ارض اپنی بے پناہ

اندرونی حرکت کی بناپر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، اسی طرح کرۂ قمر بھی اپنی ایسی ہی حرکت سے دو ٹکڑوں میں منقسم ہوا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ کرۂ قمر کی یہ اندرونی حرکت اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے انھیں منتشر نہ کرپائی ہو، اس لیے وہ دونوں ٹکڑے کچھ دیر الگ رہنے کے بعد چاند کی قوت کشش سے باہم جڑ گئے ہوں، اس کے شواہد بھی ہیں کہ جب چودھویں کا چاند پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع ہوکر ضیاپاشی کرنے لگا تو لوگوں نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے اور پھر آپس میں جڑ گئے، ہندوستان میں بھی اس حادثہ کا مشاہدہ مالابار کے ایک راجہ نے بھی کیا تھا، غرض کہ جزیرۃ العرب سے لیکر بلاد شرقیہ تک بہت سے لوگوں نے قدرت کی یہ لیلا دیکھی تھی،

آج جبکہ ابن آدم کے قدم چاند پر پہنچ چکے ہیں اور پہنچتے رہیں گے، مستقبل قریب میں جب تحقیقاتی ٹولیاں چاند پر جائیں گی اور چاند کا چپہ چپہ چھان ڈالیں گی تو گمان غالب ہے کہ وہ چاند کے دو ٹکڑوں کے جوڑ کی بھی نشاندہی کرکے دنیا والوں کو قرآن کی صداقت پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرسکیں گی۔

شق القمر کی بات توضمناً آگئی تھی، اب دیکھنا اور سمجھنا یہ ہے کہ پین جیا کے مختلف وزنی اور ٹھوس ٹکڑوں نے آخر کس طرح اپنی جگہ چھوڑی ہوگی، اس کے جواب میں معاً یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ یقیناً ان کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی، ورنہ وہ جنبش نہ کرپائے ہوتے، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں کرۂ ارض کی ساخت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے، کرۂ ارض کی بناوٹ مختلف طبقات پر مشتمل ہے، جیسا کہ ذیل کی شکل سے اندازہ ہوگا:-

اس کا اوپری حصہ قشر ارض کہلاتا ہے، جو انسان اور عام حیوانات کی جولانگاہ ہے، یہ ٹھوس ہے اور مٹی اور ریت کا بنا ہوا ہے، یہ زیادہ تر آبی اور کہیں کہیں آتشی چٹانوں پر مشتمل ہے، اس کی موٹائی نصف میل کے لگ بھگ ہے، اس کے نیچے آتشی چٹانوں کا ایک طبق ہے، اسے سیال (Sial) کہتے ہیں، اس کی دبازت بیس۲۰ اور تیس۳۰ میل کے درمیان ہے، اس طبق کے نیچے نیم جامد مادہ کا ایک طبق ہے، جو تارکول کی طرح نیم جامد ہے، اسے سیما (Sima) کہتے ہیں، اس کی موٹائی اٹھارہ سو۱۸۰۰ میل ہے، یہ وہی طبق ہے جو آتش فشاں پہاڑوں کو جنم دیتا ہے، اس کے نیچے تقریباً ساڑھے اکیس سو میل موٹا طبق ہے جو مرکز تک پھیلا ہوا ہے، یہ تحت الثریٰ کہلاتا ہے، اس کے متعلق سائنسدانوں کے نظریات میں اختلاف ہے، ایک گروپ کا خیال ہے کہ زمین کے اندر بڑھتے ہوئے درجۂ حرارت کی بناپر یہ مرکزی طبق گیس کی حالت میں ہوگا، دوسرے گروپ کا یہ کہنا ہے کہ اوپری طبقوں کا اس طبق پر دباؤ اتنا شدید پڑتا ہے کہ اس دباؤ کی زیادتی سے گیس کی شکل میں ہے نہ سیال بلکہ لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ خیال ہے کہ محض ایک ہزار میل کی گہرائی پر چکنی مٹی بھی اوپر کے دباؤ سے لوہے کی طرح سخت ہوگی۔
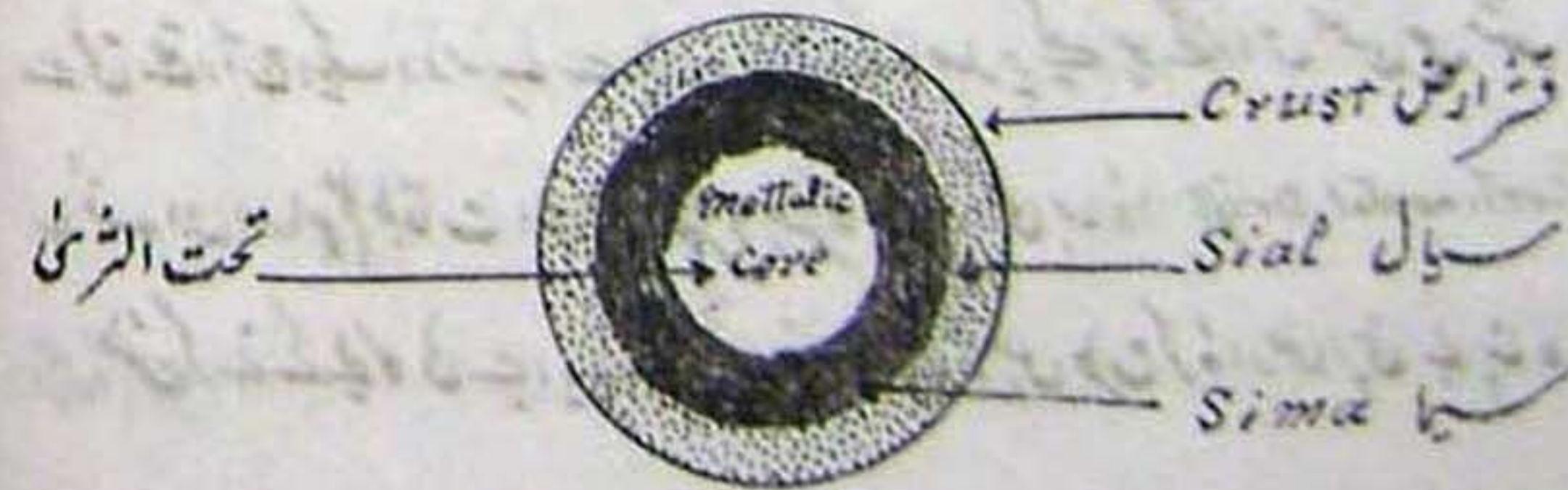
روئے زمین پر اونچے اونچے پربت بھی ہیں، سطوح مرتفع بھی ہیں اور نشیبی میدان بھی ہیں، براعظم پین جیا کے وجود میں آنے کے بعد ابتک پہاڑوں کی تعمیر کے نو۹ ادوار گذر چکے ہیں، اول چھ ادوار میں بنے ہوئے پہاڑوں کا نشان تک بھی مٹ چکا ہے، البتہ آخری تین ادوار میں بنے ہوئے پہاڑ اس وقت بھی موجود ہیں، ساتویں دور کو کیلی ڈونی دور کہتے ہیں، اس دور کو گذرے ہوئے چالیس پچاس کرور برس کا زمانہ گذر چکا ہے، بھارت میں کوہ اردلی کے

سلسلے اس دور کی زندہ یادگار ہیں، آٹھویں دور کو ہرشینی دور کہتے ہیں، وندھیاچل پربت کا ظہور اسی دور میں ہوا، اس پربت کی عمر بیس تیس کروڑ برس کے درمیان ہیں، ان دو ادوار کے پہاڑ عوامل شکست و ریخت کے ہاتھوں گھس گھسا کر نیچے اور سڈول ہو گئے ہیں، ہمالیہ، آلپس، راکی، انڈیز وغیرہ کے پہاڑی سلسلے آخری دور کی پیداوار ہیں، جسے الپائن دور کہتے ہیں، آج سے سات کروڑ برس قبل ان کا وجود نہ تھا، ہمالیہ کی جگہ تو بحر ٹیڈیز موجیں مارتا تھا، بحیرۂ روم تو اسی سمندر کا بچا ہوا ایک حصہ ہے، ہمالیہ وغیرہ نو عمر پربت کہلاتے ہیں، ان کی جڑ کرۂ ارض کے اس نیم جامد طبق کے اندر ہیں جسے سیما (Sima) کہتے ہیں، اس لیے ان پر جس قدر عوامل شکست و ریخت کا تخریبی اثر پڑتا ہے وہ اسی قدر اور ابھر آتے ہیں، لہٰذا اس بات کے امکانات اب نہیں رہ گئے کہ یہ بھی اپنے ماقبل پہاڑوں کی طرح گھس گھسا کر نیچے ہو جائیں، علاوہ بریں انکی دو پیٹیاں ہیں، ایک یوریشیا ہے جو مشرق سے مغرب اور دوسری نئی دنیا ہیں جو شمال سے جنوب کو پھیلی ہوئی ہیں، قدرت نے ان کی ساخت اور تنظیم اس نہج پر کر کے براعظمی بہاؤ کے مزید امکانات بھی ختم کر دیے ہیں،

قشر ارض اور اوپری ٹھوس طبق (Sial) وسطی نیم جامد طبق (Sima) پر اسی طرح تیر رہے ہیں، جس طرح برف کا ایک ٹکڑا پانی میں تیرتا ہے یعنی تیرتے ہوئے برف کے ٹکڑے کا ایک حصہ پانی کے اوپر اور آٹھ حصے پانی کے نیچے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے جملہ براعظم اپنی اپنی گودوں میں فلک بوس پہاڑی سلسلوں، اونچے پلیٹوؤں، اور نشیبی میدانوں کو لیے ہوئے اس نیم جامد طبق پر اسی طرح

رہے ہیں، جس طرح ایک آئس برگ سمندر میں تیرتا ہے، اگر ہمالیہ پربت یا دیگر پربتوں کی اوسط اونچائی چار میل ہے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی جڑیں تقریباً ۳۲ میل زمین کے اندر ہوں گی، گویا پہاڑ زمین پر میخوں کی طرح گاڑ دیے گئے ہیں، پھر علم طبقات الارض کی جدید تحقیق کی روشنی میں کون ہے جو قرآن کریم کی اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا

(کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا)

ایک قدیم مخطوطہ

نسمۃ السحر کا تعارف

از

جناب ڈاکٹر ایس. بی صمدی

یہ غیر مطبوعہ تصنیف علامہ ضیاء الدین ابو اسحٰق یوسف بن یحییٰ بن الحسین بن المؤید باللہ الحسنی
الصنعانی کی ہے۔ ان کی پیدائش یمن میں شہر صنعا کے ایک شریف النسب خاندان میں ۱۰۸۰ھ
مطابق ۱۶۶۹ء میں ہوئی، پیدائش کی تاریخ کا صحیح حوالہ نہیں ملتا، اور نہ تاریخ وفات ہی صحیح
طور پر معلوم ہے۔ اس کا تعین اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کے والد ابو عبد اللہ یحییٰ ابن الحسین بن
المؤید باللہ ابی الحسین محمد بن منصور باللہ الحسنی کا ذکر خود صاحب تصنیف نے اپنی اس تصنیف کی
جلد دوم میں صفحہ ۲۳۸ پر شمارہ ۱۰۲ کے ضمن میں کیا ہے۔ ان کا انتقال ۱۰۹۰ھ مطابق
۱۶۷۹ء میں ہوا۔ ان کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ ان کے والد ۱۰۸۷ھ مطابق ۱۶۷۶ء
میں حج کے لیے گئے تھے۔ اس وقت مصنف کی عمر صرف سات سال تھی، جس سے یہ نتیجہ
نکلتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۰۸۰ھ میں ہوئی۔ اسی طرح ان کی وفات کے سال کا تعین
بھی کیا گیا ہے۔ جس وقت انھوں نے اس تصنیف "نسمۃ السحر" کو مکمل کیا اس وقت
ان کی عمر تقریباً اکتیس ۳۱ سال کی تھی، تاریخ تصنیف ۱۳ رجب المرجب ۱۱۱۱ھ مطابق
۱۶۹۹ء ہے۔ سال وفات کا حوالہ ایک اور کتاب البدر الطالع میں بھی ملتا ہے، جو علامہ شوکانی

کی تصنیف ہے۔ اس میں ضیاء الدین الصنعانی کی تاریخ وفات ۱۱۲۱ھ مطابق ۱۷۰۹-۱۰ء
دی ہے۔ اور ان کے حالات بکمال شرح و بسط لکھے ہیں۔ اس حساب سے مصنف تقریباً
اکتالیس ۴۱ سال زندہ رہے۔

مصنف مذہباً زیدی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، جو امامیہ فرقہ کی ایک شاخ ہے۔ چنانچہ
انھوں نے اپنی اس کتاب میں بھی چند کے سوا انہی لوگوں کے حالات، ان کی
شاعری اور ادبی نکات کا ذکر کیا ہے، جو امامیہ یا زیدی ہیں۔

اس تصنیف کا نام بھی اسی رعایت سے "نسمۃ السحر فی من تشیع و شعر" رکھا ہے،
یعنی نسیم سحری جس میں ان لوگوں کے حالات ہیں جو شیعہ بھی تھے اور شاعر بھی۔ یہ کتاب دو ۲
جلدوں میں ہے، اور دنیا میں اس کے صرف تین نسخے پائے جاتے ہیں۔ پہلا خدا بخش اورینٹل
لائبریری میں ہے۔ اس کا نصف اول دوشنبہ کی شب میں ۱۴ ربیع الآخر ۱۱۹۷ھ مطابق
۱۷۸۳ء میں مکمل ہوا، کاتب کا نام عبد الکریم بن احمد ہے۔ دوسرا حصہ بھی اسی خط میں ہے،
مگر اس کا سنہ تکمیل درج نہیں ہے۔ خدا بخش لائبریری کے مخطوطے کا شمارہ ۱۹۶/۷ اور ۱۹۷/۷
اور جلد ۲۴۷/۷ اور ۲۴۸/۸ ہے۔ جلد اول میں ۲۵۲ اوراق اور ہر صفحہ میں ۲۴ سطریں
ہیں، کتاب کا سائز ۳½ × ۶ : ۶½ × ۸½، دوسری جلد کا سائز بھی یہی ہے، اوراق
کی تعداد ۲۷۵ ہے، پہلی جلد میں پچاسی ۸۵ اشخاص کے حالات اور دیگر ادبی و شاعرانہ
نکات اور دوسری جلد میں ۱۱۲ اشخاص کے سوانح حیات اور ادبی زندگی کا تذکرہ ہے،
ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے رہا ہے، اور ان کا زمانہ کئی صدیوں تک پھیلا ہوا
ہے، حالات میں کسی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً جلد اول میں جن اشخاص کے نام
میں پہلے "ابو" آیا ہے، جیسے ابو العباس یا ابو الحسن وغیرہ۔ ان کا ذکر شروع میں ہے، مگر

پھر آگے چل کر شمارہ ۱/۶ پر احمد ہے، اس کے بعد شمارہ ۱/۷ پر ابو الرقیق کا ذکر اور شمارہ ۱/۸ پر شمس الدین محمد کا حال ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کی ترتیب نہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، اور نہ سنہ پیدائش کے اعتبار سے، جلد دوم میں بھی یہی بے ترتیبی ہے، مردوں کے علاوہ چند خواتین کا بھی ذکر ہے، مثلاً حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت امام حسینؑ کی اہلیہ رباب بنت امرء القیس بن عدی، زینب بنت محمد بن احمد بن الامام الحسن بن علی بن داؤد الحسینیہ الیمنیہ

گو اس کتاب میں شیعہ اہل علم و کمال کے حالات ہیں، لیکن چند ایسے سنیوں کا بھی ذکر ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے آل اطہار سے نسبۃً زیادہ محبت رکھتے تھے، ممتاز ناموں میں چند خلفاء اور حکمرانوں کے نام بھی ہیں، جن میں حسب ذیل خاص طور سے قابل ذکر ہیں خلیفہ عباسی المامون، سیف الدولہ الحمدانی، ملک الافضل ابن صلاح الدین الایوبی منتصر باللہ العباسی، واثق باللہ العباسی اور فاطمی خلفاء میں المعتز، آمر باحکام اللہ، المنصور العزیز باللہ، ان کا ذکر جلد دوم میں ہے، اصحاب علم و ادب میں ابو الفرج الاصفہانی صاحب کتاب الاغانی، المقامات کے مصنف الحریری، اندلسی شاعر ابن ہانی مشہور ادیب ابوبکر الخوارزمی، شہرۂ آفاق ادیب اور کاتب ابن العمید کے حالات ہیں، مشہور شاعروں میں فرزدق کا حال ہے، جن کو آل علی سے محبت کی پاداش میں قید و بند کی مصیبت جھیلنا پڑی، مگر یہ سب تذکرے بے ترتیب ہیں، اس سے قطع نظر یہ نہایت قیمتی اور مفید مخطوطہ ہے، اور تحقیقی کاموں میں اس کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کی اہمیت کی بنا پر اس کا ایک صحیح نسخہ مرتب کرنے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (U.C.G) نے راقم کو منتخب کیا ہے، میں نے اس مخطوطہ کے کچھ حصے کا ایک صحیح نسخہ مختلف نسخوں کی مدد سے

تیار کیا ہے، اب وہ اشاعت کے لائق ہو گیا ہے، مگر ہندوستان میں ایسی چیزوں کی قدر کم ہے، یہاں کون ناشر اس کے لیے تیار ہوگا، دوسرے ملکوں مثلاً بیروت یا قاہرہ وغیرہ میں ان کی اشاعت کی زیادہ گنجائش ہے، اس مخطوطہ کے دوسرے جو دو نسخے پائے جاتے ہیں ان میں سے ۱/۲ آصفیہ لائبریری حیدر آباد دکن میں ہے، اس کا حال اس کتب خانہ کی فہرست کے صفحہ ۱/۳۴۲ پر درج ہے، یہ نسخہ بھی دو جلدوں میں ہے، اور فن تراجم کی فہرست میں اس کا شمار ۱۱۴۳ اور ۱۱۴۴ ہے، پہلے نسخہ کی طرح اس کی کتابت بھی ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۳ء میں ہوئی ہے، اس کے نصف اول کے اوراق کی تعداد ۴۰۲ ہے اور ہر صفحہ میں ۲۸ سطریں ہیں، اور نصف دوم کے اوراق کی تعداد ۵۲۰ اور سطور فی صفحہ ۲۶ ہیں، اس میں بھی سنہ تالیف ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء درج ہے، تیسرا نسخہ برلن میں ہے، اس کا شمارہ ۳۴۲۳ ہے، ان مخطوطات کے آخر میں ایک مقالہ بھی ہے، جو بدیع الزمان الہمدانی متوفی ۳۹۸ھ مطابق ۱۰۰۸ء کے اسلوب میں المقامۃ الشاویہ کے طرز پر ہے۔

خلفا میں مامون کے حالات نسبۃً مفصل ہیں، مگر مولانا شبلی نے المامون میں جس قدر حالات لکھے ہیں، اس میں مامون کی شاعری کے علاوہ کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ مامون دوسرے علمی کمالات کے ساتھ خوشگو اور قادر الکلام شاعر بھی تھا، ہم اس کتاب سے اس کے کچھ نمونے نقل کرتے ہیں:-

بعینیک مشتاقا فقزت بنظرۃ　　　واغفلتنی حتی اساءت بک الظنا

وردت طرفا فی محاسن وجہہا　　　ومتعت فی استمتاع نعمتہا أذنا

اراہ ترا منہا بعینیک لم یکن　　　لقد سرقت عیناک من وجہہا حسنا

میں تیری دونوں آنکھوں کا مشتاق ہوں، میں نظر ڈالنے میں تو کامیاب ہوا اگر تیری غفلت

نے بدگمانی پیدا کردی، پھر میں نے دوبارہ اس کے چہرے کی خوبصورتی کی طرف نظر کی اور اس کی نعمت کا فائدہ کان کے ذریعہ اٹھایا، تیرے چہرے کی خوبصورتی میں آنکھوں کا اثر دیکھتا ہوں، تیری آنکھوں نے چہرے کی خوبصورتی کو چرا لیا ہے،

مامون ایک ایرانی لونڈی مراجل کے بطن سے تھا، اس لیے لوگ اس پر طنز کرتے تھے، اس نے اس کے جواب میں کہا

لا ینقذ المرء قدراً ان یکون له ام من الروم أو سوداء عجماء
وانما هن للاولاد ادعیة مستودعة وللابناء آباء

اگر کسی کی ماں رومی یا سیاہ فام عجمی ہو تو اس سے اس کی قدر کم نہیں ہوتی، کیونکہ مائیں تو اولاد کیلیے امانتدار ظرف کی حیثیت رکھتی ہیں، دراصل بیٹوں کی نسبت تو باپوں سے ہوتی ہے، وہ شطرنج کا بہت شوقین تھا، مگر اس میں مشاق نہیں تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ میں دنیا کے امور میں تو ہوشیار ہوں اور ان میں مجھے پوری قدرت حاصل ہے لیکن شطرنج کے دو بالشت کے چوکھٹے میں میں عاجز رہ جاتا ہوں، اس نے شطرنج کی بساط کی تعریف میں حسب ذیل اشعار کہے ہیں

أرض مربعة حمراء من أدم ما بین الفین مخصوصین بالکرم
هذی یکر علی هذی وذاك علی هذی یغیر وعین الحزم لم تنم
تذاکرا الحروب فاختارا لها مثلاً من غیر ان یأثما فیها بسفك دم
فانظر الی حکمة حاقت بمعرکة من عسکرین بلا بوق ولا علم

یہ ایک چوکور سرخ رنگ کے چمڑے کی بساط ہے، اور ان لوگوں کے درمیان جو آپس میں محبت رکھتے ہیں، الفت کا ایک ذریعہ ہے، یہ اس پر حملہ کرتا ہے اور وہ اس پر حملہ کرتا ہے، اور کھیل میں ہوشیار آنکھ ذرا بھی نہیں غافل ہوتی، دونوں فریق جنگ کی باتیں کرتے اور بغیر خونریزی کیے اس کی مثال قائم کرتے ہیں، یہ کتنی بڑی حکمت ہے کہ دونوں فریق کے درمیان معرکہ زوروں پر ہے، مگر نہ بگل بجتا ہے اور نہ علم بلند ہوتا ہے۔

۲۰۸ھ مطابق ۸۲۳ء میں جب مامون روم پر حملہ کے لیے بغداد سے روانہ ہوا اور جنگ کے لیے زرہ پہنی تو اس کی لونڈی رونے لگی، اس کے آنسو رخساروں پر موتیوں کی طرح بہنے لگے، اور اس نے یہ اشعار پڑھے:

سادعو دعوة المضطر ربا یثیب علی الدعا ویستجیب
لعل الله ان یکفیك حربا ویجمعنا کما تهوی القلوب

میں اپنے رب سے ایک مضطر کی طرح دعا کرتی ہوں جو اس پر اجر بھی دیتا ہے اور اس کو قبول بھی کرتا ہے، اور مجھے امید ہے کہ میرا رب جنگ میں آپ کی مدد کرے گا اور ہم کو پھر ایک دوسرے سے ملائے گا۔

اس کے جواب میں مامون نے یہ اشعار پڑھے،

فیا حسنها اذ یغسل الدمع کحلها واذ هی تذری الدمع منها الانامل
عشیة قالت فی العتاب قتلتنی وقتلی بما قالت هناك یحاول

یہ حسن کا کیا خوب منظر ہے جب آنسو اس کے سرمہ کو دھو رہے تھے، اور وہ اپنی انگلیوں سے ان کو پونچھ رہی تھی، رات کو اس نے غصہ سے کہا تو نے مجھے قتل کر ڈالا اور اس کے اس کہنے نے مجھے مار ڈالا اور میرا یہ قتل ہونا دبل) بھی ہو گیا۔

اور سرور خواجہ سرا کو حکم دیا کہ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں اس لونڈی کو عزت وتکریم کے ساتھ رکھنا۔

اگر اخطل کا یہ شعر ہے :۔

قوم اذا حاربوا شدوا مآزرھم | دون النساء ولو باتت باطھار

وہ ایک ایسی قوم ہیں کہ جب جنگ کرتے ہیں تو اپنی عورتوں سے دور رہتے ہیں،

نظر میں نہ ہوتا تو میں نہ جاتا،

اس کا میلان شیعیت کی طرف تھا، اس نے اپنے مسلک کا اظہار حسب ذیل اشعار میں کیا ہے :۔

اقسم باللہ والآلہ | والمرء عما قال مسئول

ان علی بن طالب | علی التقی والبر مجبول

وانہ کان الامام الذی | لہ علی الامۃ تفضیل

یقول بالحق ویجتازہ | ولا تلذ امنیہ الا باطیل

کان اذا الحرب براھا الفتی | فقصرت عنھا الیھا لیل

یمشی الی القرن وفی کفہ | ابیض ماضی الحد مصقول

مشی العفر مابین اشبالہ | اشبہ المغض العسیل

میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں اور انسان جو کچھ کہتا ہے اس کا جوابدہ ہوتا ہے، کہ تقویٰ اور نیکی علی بن ابی طالب کی فطرت میں داخل تھی، وہ ایسے پیشوا تھے جن کو تمام امت پر فضیلت حاصل تھی، وہ حق گو تھے اور حق کو ابھارنے والے تھے، باطل ان کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا، جب جوانمردوں سے جنگ کا سامنا ہوتا اور عقلمندوں کی عقلیں کند ہو جائیں تو وہ اپنے مدمقابل کی طرف بڑھتے تھے، ان کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تیز دھار کی تلوار ہوتی جس پر خوب صیقل کیا ہوا ہوتا تھا، ان کی چال اس شیر جیسی ہوتی تھی جو اپنے

شیر خوار بچوں کے ساتھ ہو، اور وہ نرم اور خوشبودار جھاڑی کی طرح ہوتے،

بیہقی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ادب کی اچھائیوں اور برائیوں اور ادب اور نقد کے بارے میں المامون کی صحبت میں بحث کر رہے تھے، وہ ہماری ہمت افزائی کر رہا تھا، اس نے مجھ سے کہا "ہند بنت عقبہ کے اس قول سے اس کی کیا مراد ہے؟

نحن بنات طارق | نمشی علی النمارق

المسک فی المفارق | والدر فی المخانق

ہم طارق کی بیٹیاں ہیں، ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں، بیشک ہمارے بالوں کی مانگوں میں بھری ہوئی ہے اور خوشبو سے ہمارے گلے معطر ہیں۔

طارق سے کیا مراد ہے؟ بیہقی نے لاعلمی ظاہر کی، اس وقت مامون نے بتایا کہ نحن بنات طارق سے مراد یہ ہے کہ وہ ان چمکتے ہوئے تاروں کی بیٹیاں ہیں جو اپنی بلندی کے لیے مشہور ہیں عرب ایسے ستاروں کو طارق کہتے تھے۔ طارق کے معنی رات راستہ چلنے والے کے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے والطارق وما ادرٰک ما الطارق النجم الثاقب۔ اور قسم ہے طارق کی اور تم کیا جانو کہ طارق کیا چیز ہے وہ نجم ثاقب ہے۔ پھر یہ شعر پڑھا :۔

اجاعل انت بیقورا مسلعۃ | ذریعۃ لک بین اللہ والمطر

کیا تو گائے کے ساتھ سلعی باندھنے والا ہے تاکہ اس کو اللہ تعالیٰ اور بارش کے درمیان ذریعہ بنائے۔

اور پوچھا، اس سے شاعر کی کیا مراد ہے؟ میں نے جواب دیا مجھے علم نہیں، تو مامون نے بتایا کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب جب خشک سالی سے دوچار ہوتے تھے تو گائے کے دم میں سلعی اور عشر کی لکڑیاں باندھ دیتے تھے اور اس میں آگ لگا کر گائے کو اونچے مقام پر چڑھا دیتے تھے، اور اس سے اپنے خیال کے مطابق بجلی اور بارش کے متعلق نیک فال نکالتے تھے۔ اس سے شعر و ادب پر مامون کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

کلیات ابن یمین کا مقدمہ

از جناب محمد صفی اللہ صاحب ایم۔ اے

کلیات ابن یمین کے قلمی نسخے دنیا کے تقریباً تمام مشہور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ خدابخش خاں اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ کی فہرست میں ۲، ۳ شمارہ نمبر کے تحت درج ہے۔ ان سب نسخوں کی ابتدا ایک پُر مغز مقدمہ سے ہوتی ہے جس کے بارے میں علمائے ادب و تحقیق کی رائیں مختلف ہیں۔ "فہرست دو"[1] کے مولف بانوات زیلوگرافس کے خیال میں یہ مقدمہ ابن یمین کی اپنی تصنیف ہے، پروفیسر سید حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے بھی اپنے ایک انگریزی مقالہ[2] میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اس کے برخلاف اسپرینگر (Sprenger)، ریو (Rieu) اور خدابخش خاں لائبریری کے مرتب فہرست کی رائے ہے کہ یہ ابن یمین کا نتیجۂ فکر نہیں بلکہ کسی دوسری نامعلوم شخصیت نے لکھکر شاعر کی جانب منسوب کر دیا ہے، اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اختلاف کو راہ کیسے ملی، اور اصل حقیقت کیا ہے؟ —— یہ مقدمہ ۷۵۳ھ کی تصنیف ہے، جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے:-

"وجری ذالک فی شہر شوال بسنۃ ثلاث خمسین وسبع مائۃ

[1] "Catalogue du" Compiled by Miss et Xylographes

[2] The Preface to Kulliatat-i-Ibn-i-Yamin

دولت شاہ اور تقی کاشی جیسے فارسی تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق ابن یمین کی وفات ۷۴۵ھ میں ہوئی، چنانچہ بعض دانشمندوں نے ان کے بیان پر اعتماد کرکے یہ رائے قائم کر لی کہ اس مقدمہ کو ابن یمین نے بذات خود انشا نہیں کیا، بلکہ اس کے کسی ہمدرد یا شاگرد کے قلم کا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان فارسی تذکرہ نگاروں نے شاعر کی تاریخ وفات کے سلسلے میں پوری تحقیق سے کام نہیں لیا، جس کی بنا پر وہ اس غلطی کے مرتکب ہوئے، دراصل شاعر کی وفات ۷۶۹ھ میں ہوئی، جیسا کہ "مجمل فصیحی"[1] کے مصنف فصیحی خوافی[2] نے لکھا ہے اور اسی کتاب کے ایک قطعہ سے جسے خوافی نے شاعر کی تاریخ وفات میں نظم کیا ہے، ظاہر ہوتا ہے، وہ قطعہ یہ ہے،

بود از ہجرت ہفتصد با شصت ونہ (۷۶۹) — روز شنبہ ہشتم ماہ جمادی الاخرین
گفت رضواں خور را بر خیز استقبال کن — خیمہ بر صحرای جنت می زند ابن یمین

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ابن یمین کی وفات ۷۶۹ھ میں ہوئی، یہ ماننے میں کہ مقدمہ شاعر کی تحریر ہے، تامل نہ ہونا چاہیے، مقدمہ کی یہ عبارت اس کی سب سے بڑی شہادت ہے:-

"امابعد چنیں گوید محرر ایں مقالات و مقرر ایں کلمات العبد الواثق بالطف الصمدی محمود بن یمین المستوفی الفریومدی"۔

لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خدابخش خاں لائبریری کے مرتب فہرست نے اس واضح دلیل کے ہوتے ہوئے کیوں اس کی اصلیت سے انکار کیا ہے، شاید وہ اسپرینگر کے بیان سے دھوکا کھا گئے، اور اصل حقیقت کی دریافت تحقیق سے قاصر رہے، ریو اور ایتھ نے محض اسی قول

[1] یہ کتاب تین جلدوں میں مشہد ایران سے ۱۳۴۱ و ۱۳۳۹ھ ش میں آقای محمود فرخ کی کوشش سے چھپ چکی،

[2] ۸۴۵ھ کے بعد وفات ہوئی، اپنی کتاب "مجمل" کو اسی سال مکمل کیا۔

کی تکرار اور نقل پر اکتفا کیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایتھ اسکو نقل کرنے کے باوجود اس سے مطمئن نہ ہو سکے، اور شک وشبہہ میں مبتلا رہے، جیسا کہ ان کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے:

"اگر[۱] ابن یمین اس وقت تک زندہ تھا (یعنی ۷۵۳ھ) تو بہت ممکن ہے کہ یہ مقدمہ اسی نے لکھا ہو"

اس اشتباہ کی اصلی وجہ مقدمہ کے آخر کا پیراگراف ہے، جس میں شاعر کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے، اس لیے وہ ابن یمین کی تحریر ہرگز نہیں ہو سکتی، بلکہ الحاقی ہے، اگر شاعر خود لکھتا تو خود اپنے قلم سے اپنی تعریف ذکر تا، ایسا کرنا اس کے شایان شان نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے کسی دوست یا خیر خواہ نے ۷۵۶ھ میں اس مقدمہ کو نقل کرنے کے بعد اس میں اپنی جانب سے شاعر کی نظم ونثر کی فضیلت کی تحریر بھی شامل کر دی، بعد کے ناقلوں اور کاتبوں نے غلطی سے اس حصہ کو مقدمہ کا جز سمجھ کر ایک ساتھ لکھ دیا، اس پر بعد کے محققین کی بھی نظر نہیں پڑی، اور وہ اس دھوکے کا شکار ہو گئے، حالانکہ اس حصہ کا بنظر مطالعہ کرنے سے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اصل مقدمہ کا حصہ نہیں، بلکہ شاعر کی تحریر سے الگ ہے، وہ حصہ یہ ہے:-

"تقریب مقالات الصاحب الفاضل، مجمع الفاضل ومرجع الافاضل امیر فخر الدین محمود بن یمین الدین المستوفی الفریومدی، لازالت ریاض الفضائل مطورة برشحات اقلامہ من المنظومات لقراء نظماً ونثراً والمنثورات کما یاتی

[۱] "If Ibn-i-Yamin had been still alive at that time (i.e. 753 A.H) very probably he should have written The introduction himself." - Ethe - "Catalogue of Persian Mss. in The Bodelian library"

تفصیلها تحریراً فی اواخر ذی القعدہ سنہ ست وخمسین وسبعمائة، والحمد للہ اولاً وآخراً والصلوٰة علی نبیہ باطناً وظاہراً، وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً"

اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کے وقت یعنی ۷۵۶ھ میں شاعر بقید حیات تھا، ورنہ ناقل "لازالت ریاض الفضائل مطورة برشحات اقلامہ من المنظومات لقراء نظماً ونثراً" ہرگز نہ لکھتا، اس سے دولت شاہ اور تقی کاشی کی دی ہوئی تاریخ وفات کی تردید اور فصیحی خوافی کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ابتک اس مقدمہ پر صرف پروفیسر سید حسن صاحب نے توجہ مبذول کی ہے، علی اکبر دہخدا نے ابن یمین کے تقریباً آٹھ ہزار ابیات کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جو آجتک شائع نہ ہو سکا، "کتب مولفین چاپی فارسی[۱]" جلد چہارم میں دہخدا کی تالیفات کا شمار کیا گیا ہے، مگر اس میں اس کلیات یا دیوان ابن یمین کا ذکر نہیں ہے، دہخدا نے بھی اپنے "لغت نامہ[۲]" میں "ابن یمین" کے ذکر میں اپنی تالیف کی طباعت کے متعلق مکمل خاموشی اختیار کی ہے، رشید یاسمی نے اپنی کتاب "احوال ابن یمین[۳]" میں دہخدا کی مذکورہ تالیف کا حوالہ دیتے ہوئے، اس سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، رشید یاسمی کو بھی اس مقدمہ کے متعلق شاعر کا خود نوشت ہونے کا کامل یقین ہے۔

ابن یمین نے اس مقدمہ میں نثر نگاری کا دعویٰ کیا ہے کہ اس نے نثری مکتوب اور اپنے دیوان پر ایک رسالہ لکھا ہے، لیکن یہ نثری کارنامے علم وادب کی دنیا میں نایاب ہیں، آجتک اس کا کوئی سراغ نہ ملا، البتہ شاعر کے نثری خزانے کا یہی ایک دریتیم نمونہ کے طور پر موجود ہے، وہ بھی کلیات کے مقدمہ کی شکل میں، اس لحاظ سے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

[۱] تہران [۲] جلد آ — ابوسعید ص ۲۶۸ [۳] یہ کتاب آج سے بیالیس[۴] سال پہلے ۱۳۰۳ھ ش میں ہوئی۔

ادبیات

غزل

جناب کرامت علی کرامت

جلوۂ طور سے اُکتا کے پلٹ آئی نظر
ذوقِ عرفاں کو تھا مرغوب فقط حسن بشر

چند نادیدہ حقائق کا تصور لیکر
جھلملاتی رہی کیا جانیے کیوں شمع نظر

آب و رنگ سحر و شام کہ ہے پیش نظر
کون کہہ سکتا ہے اسکو کہ ہے یہ رقص شرر

میرے ایقان سے تابندہ ہو زہرہ کی جبیں
میرے ایمان میں پوشیدہ ہیں انوار سحر

عشق کی اس کو وسیع النظری کہہ لیجے
حسن ہی حسن ہے پھیلا ہوا تا حد نظر

ٹوٹ کر کتنوں کو مجروح یہ کر سکتا ہو
سنگ! تو نے ابھی دیکھا نہیں شیشے کا جگر

خلوتِ حسن کے آداب سے گھبرائی ہوئی
ایک تھی شمع جو جلتی تھی سر راہ گذر

غزل

جناب جامی چڑیا کوٹی

کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں راہ رو لے بے خبر پیدا
ستاروں سے بھی آگے کر چکے ہیں رہگذر پیدا

حصولِ دولتِ ایماں ہو بس مشکل زمانے میں
وگرنہ ہے بہت آسان کرنا سیم و زر پیدا

دعائیں مانگنے والو کبھی تم نے یہ سوچا ہے
دعاؤں میں تمہاری کیوں نہیں ہوتا اثر پیدا

ہزاروں قافلے صدیوں تلک منزل کو روتے ہیں
بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں راہبر پیدا

اجالا تو اجالا تیرگی بھی کام آتی ہے
اگر انسان میں ہو جائے بصیرت کی نظر پیدا

ہیں جتنے بھی قفس میں سب کے سب بال و پر شکستہ ہیں
مجھی کو یا الٰہی ہوں نہ تنہا بال و پر پیدا

دلوں کی تیرگی مٹ جائے جس کے نور سے جامی
نہیں ہوتی جہاں میں کوئی بھی ایسی سحر پیدا

غزل

جناب پروفیسر افتخار احمد فخرؔ دھولیاوی ایم اے۔ ایم، جے کالج، جلگاؤں

ہمیشہ کھیلتے آئے ہیں انکی زلف برہم سے
الجھنا سوچ کر اے گردشِ شام و سحر ہم سے

خزاں کا دور ہم سے موسم دیوانہ گر ہم سے
وہ دیوانے ہیں ہم، آباد ہے دشت کا گھر ہم سے

وہ شوقِ امتحاں میں کیوں ہیں برہم اسقدر ہم سے!
ملا ہے جب وطن کو وقت پر خون جگر ہم سے

جگر میں بیٹھ کر کہتا ہے یہ تیرِ نظر ہم سے
کہ یہ وہ زخم ہے ہوتا نہیں اچھا جو مرہم سے

رواں ہے ہر رگِ گل میں لہو اے باغباں کس کا؟
یہ ثابت ہو چمن پر ہے بہاروں کا اثر ہم سے

ہمیں ہیں جانِ میخانہ ہمیں ہیں شانِ کاشانہ
جو سچ پوچھو تو ہے ہر رونقِ دیوار و در ہم سے

ہمارے واسطے اک کھیل ہے سیلِ حوادث بھی
کہ طوفاں ہم سے گھبرائیں تو ٹکرائیں بھنور ہم سے

جنونِ سجدہ ریزی کا یہ اک ادنیٰ کرشمہ ہے
انھیں کا آستانہ تھا ہوا سجدہ جدھر ہم سے

وہ ہم ہیں کشتۂ تیغِ تغافل فخرؔ الفت میں
کہ کترا کر گذرتا ہے غبارِ رہ گذر ہم سے

مطبوعات جدیدہ

نقشِ غالب ۔ مرتبہ جناب اسلوب احمد انصاری، صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، تقطیع ۲۰×۲۶/۸، کاغذ، لکھائی، چھپائی، عمدہ، ضخامت ۲۴۲ صفحے، ناشر غالب اکیڈمی، نئی دہلی، قیمت بارہ روپے،

غالب پر ابتک معلوم نہیں کتنا لکھا جاچکا ہے، اور نہ جانے کتنا لکھا جائے گا، غزل کی ایک بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ کیا کہا گیا بلکہ جو کچھ کہا گیا وہ کس طرح کہا گیا ہے، یہی بات اب غالب کی شاعری کی تنقیدوں سے متعلق کہی جاسکتی ہے، غالب کے بارہ میں شاید کوئی نئی بات نہیں کہی جاسکے، البتہ جو بات کہی جائے گی، اُس کے کہنے کا انداز اگر نیا نہ ہوگا تو غالب کے پرستاروں کو شاید اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو، جناب اسلوب احمد انصاری صاحب نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اُس میں بڑا نیا پن ہے، انکی طبیعت میں فطری طور پر بڑی متانت ہے، جو انکی تحریروں میں بھی رچی بسی نظر آتی ہے، قارئین انکی تحریروں کی متانت سے دبتے چلے جاتے ہیں، پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس میں فکر کی ندرت ہے، ذاتی انکشاف کی تازگی ہے، ذہن کی توانائی ہے، اور قلم کی رعنائی بھی، یہ کتاب اُن کے چھ مقالات "کلام غالب کا ایک رخ"، "غالب کا فن"، "غالب اور اقبال"، "غالب کی فارسی غزل"، "ابر گہر کا ایک پہلو"، اور "خطوطِ غالب میں نفس کی پرچھائیاں"، کا ایک بیحد ہی باوقار مجموعہ ہے، جو غالب کے مختلف کمالات کا ایک نگارخانہ بھی بن گیا ہے،

اسی کے ساتھ اس میں بلند تنقید نگاری بھی پائی جاتی ہے، لائق مولف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی شاعری میں انسانی شخصیت کی خودنگری، صلابت، شکست و ریخت اور ہزیمت کے باوجود دنیائے زندگی کی قبا زیب تن کرنے کا حوصلہ ہے، تسخیر کائنات کا جذبہ ہے، ارضی حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش ہے، آفاقی عمل میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی بے پناہ خواہش ہے، انکے یہاں انسانی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں اور انسانی فطرت کی عجوبہ زائیاں تو بڑی حد تک ملتی ہیں لیکن انکی شاعری کوئی مابعد الطبیعیاتی سطح نہیں رکھتی اس اعتبار سے اقبال کو ان پر فوقیت حاصل ہے، غالب کی فارسی غزل کے متعلق ان کی رائے ہے کہ فارسی غزل میں انکی انفرادیت اتنی نمایاں نہیں جتنی اردو غزل میں ہے، وہ باوجود کوشش اور اہتمام کے نظیری، حافظ، اور بیدل کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے، غالب کے خطوط کے متعلق وہ لکھتے ہیں، ان میں انکی فعال، تہ دار، اور دلکش شخصیت کا عکس ملتا ہے کہیں ان کا معمولی اور روزمرہ کا نقش سامنے آتا ہے، جو زندگی کی لذتوں کا جویا، عواقب پر کڑی نظر رکھنے والا، اور زندگی کی اونچ نیچ سے پوری طرح واقف ہے، کہیں وہ نقش ہے، جسے وہ ایک معیار کے طور پر پیش کرتے اور جس کی طرف وہ للچائی ہوئی نظروں سے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں، اور کہیں وہ نقش ہے جسے ہم ان کا (Inverted Self) کہہ سکتے ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض باتوں سے کسی کو اختلاف ہو، لیکن لائق مولف نے ان کو کچھ ایسے باوزن طریقے پر پیش کیا ہے کہ قارئین کا ذہن غیر شعوری طور پر مسحور ہو کر رہ جاتا ہے، اس قسم کی بلند پایہ تنقیدوں کو پڑھ کر ذہن میں یہ کشمکش پیدا ہوجاتی ہے کہ غالب کی شاعری واقعی اتنی اونچی اور ارفع تھی یا تنقید نگاروں نے ان کو اونچا اور ارفع بنا دیا ہے، اگر کسی کو مؤخرالذکر رائے سے اتفاق ہو تو غالب کی شاعری کو اونچا اور ارفع بنانے والوں میں جناب اسلوب احمد انصاری کا نام بھی نمایاں رہے گا۔

مثنوی سوز وگداز (فارسی)۔ مرتبہ ڈاکٹر امیر حسن عابدی، صدر شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی تقطیع ۲۰×۲۶، کاغذ، طباعت ٹائپ عمدہ، صفحامت ۶۵ صفحے، ناشر بنیاد فرہنگ۔ ایران۔

یہ فارسی مثنوی نوعی خبوشانی کی ہے، وہ خبوشان (نزد مشہد مقدس) سے ہندوستان آیا تو اکبر کے ایک درباری امیر یوسف خاں مشہدی سے وابستہ ہوا، پھر عبدالرحیم خانخاناں کے یہاں چلا آیا، وہ اس کو برابر انعام واکرام سے سرفراز کرتا رہا، ایک ساقی نامہ کے صلہ میں اسکو دس ہزار روپے ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا عطا کیا، آخر میں شہزادہ دانیال یعنی اکبر کے بیٹے نے اس کو اپنے پاس بلالیا تھا، مثنوی سوز وگداز کا قصہ یہ ہے کہ لاہور کے دو ہندو عاشق ومعشوق ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا رہے، جب ان کی شادی ہونے لگی تو عین بارات کے روز عاشق ایک مکان کے گر جانے سے دب کر ہلاک ہوگیا، معشوقہ کو انتہائی غم ہوا، وہ ستی ہونے کے لیے تیار ہوگئی، اکبر نے اس کو اپنے یہاں بلاکر ہر قسم کی ترغیب دی لیکن وہ اپنے عاشق کے چتا پر جل مرنے سے باز نہ رہی، اسی قصہ کو منظوم کرکے نوعی خبوشانی نے اپنی مثنوی نگاری کا جوہر دکھایا ہے، نوعی خبوشانی کے معاصر مآثر رحیمی کے مولف ملا عبدالباقی نہاوندی تھے، وہ لکھتے ہیں کہ نوعی کے معاصر اساتذہ اس کی شاعری کی شتر گربگی پر اعتراض کرتے رہے، اور کہتے کہ اگر اس کے اشعار بہت بلند ہیں تو بہت پست بھی ہیں، لیکن خود مآثر رحیمی کے مولف اس کی شاعری کے بڑے معترف رہے، ان کے خیال میں وہ اپنے زمانے کا بے نظیر اور بے مثال شاعر تھا، اور مثنوی سوز وگداز خسرو شیریں کی بحر میں بہت ہی خوب کہی ہے اور اس مثنوی کی خوبی کی یہ بھی دلیل ہے کہ یہ ایران سے شائع ہوئی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اہل ایران نے اس کو سبک ہندی کی اور دوسری منظومات کی طرح ناقابل اعتبار قرار نہیں دیا، لائق مرتب نے اس کے شروع

میں ایک پر مغز مقدمہ لکھا ہے، جس میں بڑی محنت سے مختلف تذکروں میں نوعی کے متعلق جو کچھ ہے وہ سب جمع کردیا ہے، لیکن تعجب ہے کہ ان کی وسیع نظر مآثر رحیمی پر نہیں پڑی جس کے مولف نوعی سے براہ راست واقف تھے، اس معاصر [illegible] معلومات زیادہ مستند اور قابل ترجیح قرار دی جاسکتی ہیں، اس میں نوعی کا ساقی نامہ بھی درج ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اکبر کی طرف سے اس کو وظیفہ اور منصب بھی ملا، ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اس مثنوی کو شائع کرکے ایک دلچپ اور مفید کتاب اہل علم تک پہنچادی ہے، ان کو انڈو پرشین لٹریچر سے بڑا شغف ہے، اس سلسلہ میں وہ اپنی علمی سرگرمیاں بڑی محنت وکاوش سے جاری رکھے ہوئے ہیں، اب تک ہندوستان کی فارسی سے زیادہ دلچسپی نہیں لیجاتی تھی، لیکن جن ارباب علم نے ہندوستان کے فارسی شعر وادب کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی کوشش کی ہے، ان کی فہرست میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی کا نام بھی جلی بلکہ زریں حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔ "ص، ع"

مجموعۂ قوانین اسلام۔ مرتبہ جناب تنزیل الرحمن صاحب ایڈوکیٹ تقطیع کلاں کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، مجلد، صفحات ۳۶۵۔ قیمت ۱۵ روپے، ناشر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان۔

ادارۂ تحقیقات اسلام (پاکستان) نے اسلام کے عائلی، دیوانی اور فوجداری قوانین کو دس جلدوں میں جدید طرز پر مرتب ومدون کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہے، اس کی دو جلدیں پہلے شائع ہوچکی ہیں، ان پر معارف میں مفصل ریویو کیا جاچکا ہے، زیر نظر تیسری جلد مندرجہ ذیل عائلی قوانین پر مشتمل ہے:۔ (۱) نسب اولاد (۲) حضانت (۳) نفقہ اولاد وآباء واجداد (۴) ہبہ (۵) وقف

اس کی نوعیت وخصوصیات بھی وہی ہیں جو پہلی دونوں جلدوں کی ہیں، یعنی

پہلے دفعہ وار قانونی احکام بیان کر کے قرآن، حدیث، آثار صحابہ اور ائمہ و مجتہدین (بشمول اہل تشیع) کے اقوال کی روشنی میں ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، اور آخر میں اسلامی ملکوں اور پاکستان کے مروجہ قوانین کا ذکر ہے، ان میں سے جو قوانین اسلام کے خلاف تھے ان میں ترمیم کی تجویزیں پیش کی گئی ہیں، پہلی جلدوں کی طرح اس میں بھی مصنف کی ترجیحی اور مجتہدانہ رایوں میں اختلاف کی گنجائش ہے، لیکن ان کی تلاش و تحقیق اور رائے کے اعتدال میں کلام نہیں، دعا ہے کہ اس مفید سلسلہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ مصنف کی صحت و عمر میں برکت عطا فرمائے۔

مقالات امینی ۔ مرتبہ مولانا محمد تقی امینی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۶۸، قیمت آٹھ روپے، پتہ یونیورسٹی پبلیکیشنز، ظہور وارڈ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

یہ کتاب مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مندرجہ ذیل گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے، (۱) اجتہاد (۲) فقہ کی تدوین جدید (۳) فقہ کی تدوین جدید میں موجودہ حالات کی رعایت (۴) موجودہ مسائل کس طرح حل کیے جائیں (۵) فقہ کے اجتماعی مسائل (۶) خلافت فاروقی میں اراضی کی تنظیم و تقسیم (۷) ریڈیو پر رؤیت ہلال کی خبر (۸) سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت (۹) بیمہ کی حقیقت و شرعی حیثیت (۱۰) جدید دور میں جدید رہنمائی کی ضرورت (۱۱) یگا اور تہذیب جدید کی ضرورت لائق مقالہ نگار نے اسلامی فقہ و اجتہاد پر جو ان کا خاص موضوع ہے، کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، اور وقتاً فوقتاً محققانہ مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں، اس مجموعہ کے مقالات معارف اور برہان میں شائع ہو چکے ہیں، فاضل مقالہ نگار نے ان میں موجودہ زمانہ کے ان نئے مسائل

کی جانب جن کا قدیم اسلامی فقہ میں ذکر نہیں ہے، اور موجودہ اصحاب علم و نظر نے بھی ان کی طرف کم اعتنا کیا ہے، ملت کے ارباب حل و عقد کو متوجہ کیا ہے، اور بعض مسائل کو حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے، مولانا اس صاحب نظر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو انداز فکر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت بھی دی ہے، اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش و حواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کا مشورہ بھی دیا ہے، ابتدا کے پانچ مضامین میں اجتہاد و اجماع اور فقہ کی جدید تدوین کی اہمیت و ضرورت بیان کرتے ہوئے اس زمانہ میں انفرادی کے بجائے شورائی طرز کے اجتہاد کو مناسب بتایا ہے، اور کتاب کے آخری دو مضامین میں مذہب و اخلاق کی قدیم بنیادوں پر نئی عمارت تعمیر کرنے کا مشورہ دیا ہے، جدید مسائل سٹہ اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کو ممنوع اور ریڈیو پر رؤیت ہلال کی خبر اور بیمہ کو جائز قرار دیا گیا ہے، یہ آخری مضمون بڑا مبسوط ہے، اس میں بیمہ کی حقیقت و نوعیت، آغاز و ارتقاء، اس کی مختلف رائج صورتوں اور ان کے جواز و عدم جواز کے بارہ میں جدید مصری علماء کے آراء و دلائل پر مفصل گفتگو کرنے کے بعد ضرورت عامہ کے تحت اس کو جائز بتایا ہے، اور عدم جواز کے وجوہ کا جواب دیا ہے، گو ان اختلافی مسائل میں ان کی بعض رائیں محل نظر ہو سکتی ہیں، لیکن یہ سب مضامین گہرے غور و فکر، وسیع علم و مطالعہ اور بڑی تحقیق و محنت کا نتیجہ ہیں، اور ان مسائل پر بحث و نظر وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے، ان مضامین نے اس کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔

درد و اعلیٰ ۔ مرتبہ مولانا حکیم سید محمد مصلح الدین ثاقب کاظمی اعظمی تقطیع خورد

کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت دو روپے۔ پتہ لٹریری ریسرچ یونٹ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ہمارے شہر کے مشہور طبیب مولانا محمد مصلح الدین ثاقب فاضل دیوبند، اب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہیں، ان کو اردو شعر و سخن کی طرح عربی و فارسی کا اچھا ذوق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ عشق و محبت ہے، اس لیے انھوں نے بڑی عقیدت و اخلاص سے درودوں کی یہ سوغات تیار کی ہے، اور اپنے فنی ذوق و استعداد کی بنا پر اس میں صرف غیر منقوط الفاظ استعمال کیے ہیں، اور یہ التزام بھی کیا ہے کہ ہر غیر منقوط لفظ کے درود کا آخری فقرہ اسی پر ختم ہو، اس لفظی صنعت کے باوجود اس میں معنوی کیفیت بھی ہے، اور درود کے اکثر صیغے کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں، شروع میں درود شریف کے فضائل کی چند حدیثیں مع ترجمہ نقل کی گئی ہیں، اس طرح درود شریف کے جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں انھیں غالباً یہ اپنی نوعیت کا انوکھا ہے، درود شریف تقرب الی اللہ اور شفاعت نبوی کا وسیلہ ہے، اس لیے یقین ہے کہ مصنف کا یہ نذرانۂ خلوص ان کے درجات میں بلندی کا سامان اور لوگوں میں مقبول ہوگا۔

ایسے تھے گاندھی جی۔ مرتبہ جناب یو آر راؤ صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۵۶، پتہ پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند۔

یہ کتاب گاندھی جی کی سو سالہ جینتی کے موقع پر طلبہ اور معمولی استعداد کے لوگوں کیلیے سہل زبان اور آسان طرز میں لکھی گئی ہے، اس میں انکی بلند شخصیت و سیرت، اونچے آدرشوں اور سبق آموز واقعات زندگی کو موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، ملک کی آزادی کی طرح گاندھی جی کا مقصد انکی اخلاقی اصلاح اور قوم کی ذہنی و دماغی تربیت بھی تھا، اس حیثیت سے یہ کتاب جو نئی نسلوں کو انکے پیغام اور تعلیمات سے واقف کرانے کیلیے لکھی گئی ہے، نہایت مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۹۔ ماہ ذوالحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۲ء۔ عدد ۲

مضامین